جلد۱۱ شمارہ۳ مارچ۱۹۹۹ء ذوالقعد۱۴۱۹ھ

فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	محمد بلال	۲

شذرات

بسنت اور ہمارا رویہ	محمد بلال	۴

قرآنیات

البیان: البقرہ۲: ۲۱-۲۵ (۵)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

بیعت	طالب محسن	۱۱
عورتوں کو نصیحت	طالب محسن	۱۵
برا خواب دیکھنے کے بعد کی دعا	ساجد حمید	۱۹

دین و دانش

اصول و مبادی (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۲۱
قانون معیشت (۶)	جاوید احمد غامدی	۲۶
التزام جماعت —— اعتراضات کا جائزہ (۳)	معز امجد	۴۴

مدیر کے نام

متفرق خطوط	عبدالرشید عراقی — ڈاکٹر ظفر اعجاز مشتاق احمد - ریحان احمد	۵۲

یسئلون

متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی - طالب محسن	۵۸

تبصرۂ کتب

"مختصر تاریخ خلافتِ اسلامیہ"	طالب محسن	۶۲

ادبیات

اونٹوں کی دنیا (افسانہ)	محمد بلال	۶۶
صبحِ بہاراں (نظم)	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس شمارے میں

انسان کی شخصیت کی تعمیر میں بچپن کے زمانے کی بے پناہ اہمیت ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب انسان کی عادات پیدا ہونے کی ابتدا ہوتی ہے۔ پھر ان کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اور اس طرح بالغ ہونے تک یہ عادات پختہ ہو جاتی ہیں۔ اور اگر یہ عادات منفی ہوں تو بسا اوقات ان کی اصلاح آدمی کے تائب ہونے کے بعد بھی نہیں ہو پاتی۔

اصلاح و دعوت کا کام کرنے والے لوگ نوجوانوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں مگر بچوں کو بالعموم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ متوازن نہیں ہے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اچھا رہنما حال ہی میں نہیں الجھا رہتا بلکہ وہ مستقبل پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ اس لیے کہ آج کا بچہ کل کا جوان ہے۔ آج انگلی پکڑ کر چلنے والا کل دوسروں کو راہ دکھانے والا ہے۔

سوال یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کس طرح کی جائے؟ اس کام کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کی ذہنی سطح پر اتر کر نظمیں کہی جائیں۔ شاعری کی گرفت اور تاثیر بے مثل ہوتی ہے۔ اس میں ترغیب اور تحریک کی معجز اثر قوت ہوتی ہے۔ اس میں کہی گئی باتیں تیر کی طرح دل میں ترازو ہو جاتی ہیں۔ شاعری کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ بہت جلد یاد ہو جاتی ہے اور طویل عرصے تک یاد رہتی ہے۔ لہٰذا وہ ترغیب جو شاعری کے ذریعے سے دی جاتی ہے، وہ ایک طویل عرصے تک اپنے اثرات دکھاتی رہتی ہے۔

یہ کمپیوٹر ایج ہے۔ مشینی دور ہے۔ اس دور کی یہ خصوصیت اپنے اندر مثبت اور منفی، دونوں قسم کے پہلو رکھتی ہے۔ منفی پہلو یہ ہے کہ اس نے انسان کو فطرت سے دور کر دیا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ فطرت سے دوری، فاطر سے دوری کا باعث بنتی ہے۔ ظاہر ہے اس چیز کا اثر بچوں پر بھی پڑا ہے۔ ان کا بھی بہت سا وقت مشینوں کے ساتھ گزرتا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں بھی مادی رویہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ رویہ پھر پختہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ بڑے ہو کر بھی اسباب کی دنیا میں الجھے رہتے ہیں اور ماورائے اسباب دنیا سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔

اس وقت ''ادبیات'' کے ذیل میں بچوں کی ایک نظم شائع کی گئی ہے۔ اسے بچوں کو بالخصوص اپنے بچوں کو یاد کرانا چاہیے۔ یہ محض شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ منظوم تذکیر و نصیحت ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

بند کمروں میں کمپیوٹر گیموں کے شور میں وقت گزارنے والے بچے جب یہ نظم پڑھیں گے تو امید ہے انھیں کھلی فضا اور کھلی ہوا میں فطرت کے سریلے نغمے سننے اور رنگین مناظر کو دیکھنے کی ترغیب ملے گی۔ پھر ان کی آنکھیں اور کان فطرت کی طرف متوجہ ہوں گے تو نہ صرف یہ کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوں گے بلکہ اس کے ساتھ ان کے اندر فاطر کی بے پناہ عظمت، بے پایاں قدرت اور بے مثل ربوبیت کا احساس بھی ابھرے گا جس سے ان کے اندر خدا کے خوف اور شکر کے جذبات جنم لیں گے۔ انھی جذبات سے بندگی کا ظہور ہوتا ہے جو در اصل انسان کی وجۂ تخلیق ہے۔

''ادبیات''ہی میں ایک افسانہ طبع کیا گیا ہے۔ افسانہ ایک ایسی مختصر کہانی ہوتی ہے جو ایک نشست میں پڑھی جا سکے۔ اس کی بنیاد میں بالعموم ایک خاص کردار، ایک خاص واقعہ، ایک خاص تجربہ یا ایک خاص تاثر ہوتا ہے۔ افسانے کے بارے میں عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اس کے اندر من گھڑت باتیں ہوتی ہیں، بلکہ لفظ ''افسانہ'' لفظ ''جھوٹ'' کے متبادل کے طور پر استعمال کر لیا جاتا ہے۔ ایک پہلو سے دیکھیں تو یہ بات اگرچہ ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے پہلو سے سوچیں تو یہ بات صد فی صد صحیح نہیں ہے۔ ایک زمانے میں غزل کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ اس کا موضوع حسن و عشق کے حوالے سے دردِ فراق کیفِ وصال اور اضطرابِ انتظار ہی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ غزل کا کینوس بہت وسیع ہو گیا اور علمی، فکری، مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل بھی اس کا موضوع بننے لگے —— ''اشراق'' کے پچھلے شماروں میں ایسی غزلیں شائع ہو چکی ہیں —— یہی معاملہ افسانے کا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں، ایک عرصہ ہوا افسانہ زندگی کے تلخ حقائق کو اپنا موضوع بنا رہا ہے۔ معاشرے کے جیتے جاگتے کردار اس میں بنیادی حیثیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح افسانہ محض جذباتی تسکین یا ذہنی تفریح ہی کا سامان فراہم نہیں کرتا بلکہ یہ اپنے اندر ایک قابلِ ذکر تعمیری پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ ''قرآنیات''، ''معارفِ نبوی''، ''دین و دانش''، ''مدیر کے نام''، ''یسئلون''، ''تبصرۂ کتب'' اور ''ادبیات'' کے سلسلے حسبِ روایت موجود ہیں۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بسنت اور ہمارا رویہ

ہر موسم ہماری زندگی پر مختلف پہلوؤں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر موسم ایک پہلو سے خوش گوار اثر ڈالتا ہے تو دوسرے پہلو سے ناگوار مسائل پیدا کر دیتا ہے، لیکن بہار کا موسم اس خصوصیت سے مستثنیٰ ہے۔ یہ خوش گوار اور صرف خوش گوار موسم ہوتا ہے۔ جب یہ موسم آتا ہے تو سردی کی شدت سے بند کمروں میں ''مقید'' انسان ''آزاد'' ہو جاتا ہے۔ موٹے موٹے کپڑوں کا بوجھ اس کے جسم سے اتر جاتا ہے۔ بے رنگ باغوں کا ماحول قسم قسم کے پھولوں سے رنگین ہو جاتا ہے۔

ہماری زندگی میں یہ تبدیلی کون لاتا ہے؟ یہ خوش بودار ہوا، یہ خوش گوار ہوا، یہ بہار کی ہوا کون چلاتا ہے؟ یہ سرسوں پھوٹنے، یہ شگوفے نکلنے اور یہ گیہوں کی بالیوں میں دانے پڑنے کا دل کش سماں کون پیدا کرتا ہے؟ یہ سارا دن پرندوں کے چہچہانے، یہ موروں کے ناچنے، یہ ہرنوں کے کلیلیں کرنے کا مسرور کن منظر کون دکھاتا ہے؟ لاریب، وہ جو زمین و آسمان اور اس کے اندر ساکن اور متحرک ہر چیز کا خالق، ناظم اور مالک ہے۔

اگر ہم کہیں گرمی کی شدت سے پسینے میں شرابور ہو رہے ہوں اور ایسے میں کوئی شخص ہمارے سامنے پنکھا لا کر چلا دے یا ہم کہیں سردی کی شدت سے ٹھٹھر رہے ہوں اور ایسے میں کوئی شخص ہمارے سامنے ہیٹر لا کر جلا دے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارے دل میں اس شخص کے لیے شکر کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ شکریہ، تھینک یو، مہربانی کے الفاظ تو فوراً زبان پر آ جاتے ہیں۔

ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی ہمارے ہاں بہار کی آمد ہوئی جس کے نتیجے میں ہمارے کسی ایک کمرے ہی کی فضا سازگار نہیں ہوئی بلکہ ہمارے گھروں، ہمارے محلوں، ہمارے میدانوں کی فضا بھی سازگار بلکہ خوشگوار

ہو گئی۔ اس پر ہم نے خوشی کا اظہار کیا، بسنت کا تہوار منایا مگر خدا کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس رویہ اختیار کیا۔ سرکشی کا رویہ۔ سرکشی کا رویہ کیسے ؟

دیکھیے، قرآنِ مجید میں ہے:

بَلِ اللّٰهَ فَاعۡبُدۡ وَكُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ. (الزمر ۳۹: ۶۶)

''بلکہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزاروں میں سے بنو۔''

ایک دوسرے مقام پر ہے:

وَاعۡبُدُوۡهُ وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ. (العنکبوت ۲۹: ۱۷)

''اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار بنو۔''

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل دیکھیے۔ حضور رات کی نماز میں بہت طویل قیام کیا کرتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور سے کہا: آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخشے جا چکے، پھر آپ اتنی مشقت کیوں کرتے ہیں؟ حضور نے فرمایا: کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔[1]

لہٰذا خدا کا شکر ادا کرنا، خدا کی بندگی اختیار کرنا ہے۔ اور خدا کی بندگی اختیار کرنا، خدا کا شکر ادا کرنا ہے۔ اب ظاہر ہے خدا کا شکر ادا نہ کرنا، سرکشی اختیار کرنا ہی ہے۔

ہم نے نہ صرف یہ کہ آمدِ بہار پر خدا کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ معاملہ اس طرح سنگین تر کر دیا کہ اس موقع پر بسنت مناتے ہوئے کچھ باتوں میں اللہ کی حدود کو پامال کر دیا: ہم نے کریکر چلائے، بلند آواز سے بے ہودہ گانے بجائے، بوکاٹا کی آوازیں لگائیں، ہوا میں گولیاں چلائیں، ہمسایوں کو تکلیفیں پہنچائیں، بچوں کی نیندیں اڑائیں، خواتین کے لیے مشکلیں پیدا کیں۔ ان کے لیے اپنے گھر کی چھت پر آنا محال بنا دیا۔ ان کے لیے اپنے گھر کے صحن میں بیٹھنا دشوار کر دیا۔

دین جذبات کے اظہار پر پابندی نہیں لگاتا۔ وہ جذبات کے اظہار کو کچھ حدود کا پابند کرتا ہے۔ یہ وہ پابندی ہے جو انسان کو حیوان سے اور معاشرے کو جنگل سے ممیز کرتی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جذبات جب اپنا اظہار کرتے ہوئے حدود نا آشنا ہو جاتے ہیں تو اس صورتِ حال کو تہذیب نہیں بد تہذیبی کہا جاتا ہے۔

خدا نے ہمیں خیر و شر کا شعور دیا۔ رد و قبول کا اختیار دیا۔ اور ہماری آزمایش کا ایک سلسلہ چلا دیا۔ اب یہ ہم پر

۱۔ صحیح مسلم، کتاب صفات المنافقین واحکامہم۔

ہے کہ ہم اس کی شکر گزاری کرتے ہیں یا سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم اپنا نفع چاہتے ہیں یا نقصان۔ اور یہ ہم پر ہے کہ ہم تہذیب کے تحت زندگی گزارتے ہیں یا معاشرے کو جنگل بناتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم انسان کہلاتے ہیں یا حیوان۔

—— محمد بلال

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۵)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً

(اِن [۳۸] کے پیچھے لگ کر تم اپنے آپ کو برباد کیوں کرتے ہو)، اے لوگو، تم اپنے اُس پروردگار کی بندگی کرو [۳۹] جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور تم سے پہلوں کو بھی۔ [۴۰] یہی صورت ہے جس سے تم

۳۸۔ یہود سے صرفِ نظر کر کے یہ ذرا دیر کے لیے مشرکینِ یثرب کی طرف التفات ہے جو خدا کے اِن دشمنوں کی وسوسہ اندازیوں سے متاثر ہو کر اِن کے اعتراضات بے جانے بوجھے دہرا رہے تھے اور اِس طرح اپنے آپ کو اُس نعمتِ عظمیٰ سے محروم کر رہے تھے جو خدا نے قرآن اور پیغمبر کی صورت میں اُنھیں عطا فرمائی تھی۔

۳۹۔ یعنی وہ بندگی جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ بندگی کے لیے اصل میں لفظ 'اعبدوا' استعمال ہوا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ لفظ جب اپنے جامع مفہوم میں استعمال کیا جائے تو پرستش اور اطاعت دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

۴۰۔ یعنی تمھارے اُن بزرگوں کو بھی پیدا کیا ہے جنھیں تم خدائی صفات میں شریک قرار دیتے ہو اور

وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّكُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ

(اُس کے عذاب سے) بچنے کی توقع کر سکتے ہو۔[۴۱] (وہی) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے اوراِسی آسمان سے پانی اتارا ہے، پھر اُس سے تمھاری روزی کے لیے طرح طرح کے میوے پیدا کر دیے ہیں۔ اِس لیے تم اللہ کے ہم سر نہ ٹھیراؤ، درآں حالیکہ تم (اِن سب باتوں[۴۲] کو) جانتے ہو۔[۴۳] ۲۱-۲۲

(یہی اِس کتاب کی دعوت ہے۔ اِسے مانو[۴۴] اے لوگو)، اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے، اِس کے بارے میں اگر تمھیں شبہ ہے تو (جاؤ اور) اس کے مانند ایک سورہ ہی بنا لاؤ[۴۵]

اُن کے بت بنا کر اُن کی پرستش کرتے ہو۔

۴۱۔ اصل الفاظ ہیں: 'لعلکم تتقون' ان میں 'تتقون' کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اسے قرآن نے اس کے بعد کی آیت 'فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارة' میں خود واضح کر دیا ہے۔

۴۲۔ یعنی خدا کے بارے میں وہ سب باتیں جن کا ذکر ان آیات میں ہوا ہے۔

۴۳۔ 'جانتے ہو' کے الفاظ یہاں 'مانتے ہو' اور 'اقرار کرتے ہو' کے مفہوم میں آئے ہیں۔

۴۴۔ یعنی شرک کی ہر آلایش سے بالکل پاک ہو کر خدا کی بندگی کرنے کی جو دعوت یہ کتاب لے کر نازل ہوئی ہے، اِسے مانو اور اس کے مطابق خدا کی بندگی کرو۔

۴۵۔ مطلب یہ ہے کہ تم اگر اسے خدا کی کتاب نہیں سمجھتے تو اپنی ہدایت اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے جس شان کا یہ کلام ہے، اس شان کی کوئی ایک سورہ ہی بنا کر پیش کر دو۔ تمھارے گمان کے مطابق یہ کام اگر تمھاری قوم کے ایک فرد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر سکتے ہیں تو تمھیں بھی اس میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیے۔ اپنے متعلق یہ قرآن کا چیلنج ہے جو اُس نے اپنے اولین مخاطبین کو دیا اور اُن میں سے کوئی بھی اس کا

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا
وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٤﴾
وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ

اور خدا کو چھوڑ کر (اِس کے لیے) اپنے سب حمایتی[46] بھی بلا لو، اگر تم اپنے اِس گمان میں سچے ہو۔[47] پھر اگر نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن[48] یہ لوگ بھی ہوں گے (جو نہیں مانتے) اور اِن کے وہ پتھر بھی (جنھیں یہ پوجتے ہیں[49])، آگ جو اِنھی منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور (اِس کے ساتھ، اے پیغمبر)، اُن لوگوں کو بشارت دو جو (اِس کتاب پر) ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کیے، اِس بات کی بشارت کہ اُن کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اُن کا کوئی پھل جب اُنھیں کھانے کے لیے دیا جائے گا تو کہیں[50]

سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

۴۶۔ یعنی جنوں اور انسانوں میں سے اپنے وہ سب حمایتی جو تمھارے اس دعوے میں شریک ہیں اور جن میں سے بعض کو تم خدائی اختیارات کے حامل سمجھتے ہو۔

۴۷۔ یعنی اپنے اس گمان میں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں۔

۴۸۔ مطلب یہ ہے کہ اس آگ کی مرغوب غذا یا وہ جسم ہوں گے جن میں کفر و شرک کا مواد بھرا ہوا ہے اور یا وہ پتھر جو معبود کی حیثیت سے اس دنیا میں پوجے گئے ہیں۔ یہ آگ اپنے اصلی رنگ میں انھی دو چیزوں سے بھڑکے گی۔

۴۹۔ یہ پتھر اپنے پوجنے والوں کی فضیحت اور اِس طرح اُن کے عذاب میں اضافے کے لیے دوزخ میں پھینکے جائیں گے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ دنیا میں جن کی خدائی کا شہرہ تھا، آج وہ کس انجام کو پہنچے ہیں۔

۵۰۔ یعنی اپنے دل میں کہیں گے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے[۵۱] ہمیں دیا گیا، دراں حالیکہ یہ جو اُنھیں دیا جائے گا، یہ اُس سے ملتا جلتا ہو گا،[۵۲] اور اُن کے لیے وہاں پاکیزہ[۵۳] بیویاں ہوں گی اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔۲۳-۲۵

۵۱۔ یعنی اس سے پہلے اسی جنت میں۔

۵۲۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نہیں ہو گا بلکہ اُس سے ملتا جلتا ہو گا۔ یہ جنت کی نعمتوں کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے کہ وہ ہر دفعہ نئے حسن، نئی لذت اور نئے ذائقے کے ساتھ سامنے آئیں گی۔ ایک ہی پھل جب بار بار کھانے کے لیے دیا جائے گا تو ہر مرتبہ لذت، حسن اور ذائقے کی ایک نئی دنیا اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔

۵۳۔ اصل الفاظ ہیں: 'ازواج مطھرة'۔ ان میں 'مطھرة' کی صفت سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ وہ اچھوتی ہیں، ان کی تربیت نہایت اہتمام اور توجہ کے ساتھ ہوئی ہے اور انھیں اس طرح سنوارا اور پاکیزہ بنایا گیا ہے کہ اہلِ جنت کی رفاقت کے لیے وہ پوری طرح موزوں ہو گئی ہیں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

بیعت

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۸)

وعن عبادة بن الصامت قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وحوله عصابة من اصحابه: بايعونى على ان لا تشركوا باللّٰه شيئا، ولا تسرفوا، ولا تزنوا، ولا تقتلوا اولادكم، ولا تاتوا ببهتان تفترونه بين ايديكم وارجلكم، ولا تعصوا فى معروف. فمن وفى منكم فاجره على اللّٰه. ومن اصاب من ذلك شيئا ثم ستره اللّٰه عليه فى الدنيا، فهو الى اللّٰه. ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه. فبايعناه على ذلك.

لغوی بحث

'عصابة': یہ بھی 'عصبة' کی طرح اسمِ جمع ہے اس کے معنی ٹولی کے ہیں۔

'بايعونى': یہ 'بیع' سے باب مفاعلۃ ہے۔ لیکن یہ ہر نوع کے معاہدوں کے لیے آتا ہے۔

'بين ايدكم وارجلكم': لفظی مطلب ہے جو ہاتھوں اور ٹانگوں کے بیچ میں ہے۔ یہ ترکیب صنفی اعضا کے لیے آتی ہے۔

'اصاب': یہاں یہ ''مرتکب ہونا'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

'معروف': پہچانا ہوا۔ اس سے وہ تمام امور مراد ہوتے ہیں جو معاشرے میں بھلائی اور خیر کے امور سمجھے

جاتے ہیں۔ اسی طرح اس لفظ کا اطلاق اعلیٰ رسوم ورواج اور آداب پر بھی ہوتا ہے۔

ترجمہ

''حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبکہ آپ کے اصحاب کی ایک ٹولی آپ کے گرد بیٹھی تھی فرمایا: مجھ سے بیعت کر لو، اس بات پر کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنے بچوں کو قتل نہ کرو گے، کسی پر زنا کی تہمت نہ لگاؤ گے اور کسی معروف کے معاملے میں میری نافرمانی نہ کرو گے۔ پھر جس نے (یہ عہد) پورا کیا اس کا اجر اس کے خدا کے پاس ہے اور جو ان میں سے کسی چیز کا مرتکب ہوا پھر اسے اس دنیا میں سزا بھی ملی تو یہ سزا اس کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ اور جو ان میں سے کسی چیز کا مرتکب ہوا لیکن اللہ نے اس کے کیے پر پردہ ڈالا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ چاہے تو معاف کرے اور چاہے تو سزا دے۔ چنانچہ (ہم نے آپ کا یہ ارشاد سن کر) آپ سے ان باتوں پر بیعت کر لی۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متون

اس روایت کے متون میں بعض اختلافات محض لفظی ہیں۔ مثلاً 'حوله عصابة' کی جگہ 'فی مجلس' یا 'فی رهط' کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔ اسی طرح بعض روایات میں 'اصاب' کے بجائے 'غشی' اور 'عوقب' کے بدلے 'اخذ' کا لفظ آیا ہے۔ کچھ روایات میں 'کفارہ' کے ساتھ 'طهور' کا لفظ بھی موجود ہے۔ البتہ بعض اختلافات روایت میں اہم اضافہ بنتے ہیں۔ مثلاً اسی روایت میں بیعت کے مضمون میں 'لا یعضد بعضکم بعضا' کا جملہ بھی شامل ہے۔ ایک روایت میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ یہ بیعت کس موقع کی ہے: 'فبایعنا رسول الله صلی الله علیه وسلم علی بیعة النساء وذلک قبل ان یفترض الحرب'۔ کچھ روایات میں بیعت کا مضمون بھی متکلم کے صیغے میں ہے۔ بعض روایات میں حضرت عبادہ بن صامت کا تعارف بھی شامل ہے جس میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ وہ نہ صرف جنگ بدر کے شرکا میں سے تھے بلکہ اس سے پہلے بیعتِ عقبہ میں بھی شامل ہوئے تھے۔ عبادہ بن صامت ہی سے ایک دوسری بیعت کا مضمون بھی روایت ہوا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے ہر حال میں اطاعت کا عہد لیا ہے۔ یہ بات تو مضمون ہی سے واضح ہے کہ یہ دو الگ الگ بیعتیں ہیں، لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں

کے مواقع کیا ہیں۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے جس روایت کو لیا ہے یہ روایت معنوی پہلو سے ایک مکمل روایت ہے۔ لیکن معلومات کے پہلو سے اس میں بعض چیزیں بیان نہیں ہوئیں، جن کی تفصیل ہم اوپر کر چکے ہیں۔

معنی

یہ روایت دو پہلوؤں سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ایک سیرت اور دوسرے گناہوں کی تلافی۔ ہم متون سے متعلق بحث میں دو نوعیت کی بیعت کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان میں سے سمع وطاعت کی بیعت کا تعلق عقبہ سے ہے اور یہ بیعت اس دور سے متعلق ہے جب تمام اطرافِ عرب سے لوگ جوق در جوق دینِ اسلام قبول کر رہے تھے۔ پہلی بیعت ریاستِ مدینہ کے قیام کے تقاضے کی حیثیت سے لی گئی اور یہ دوسری بیعت ان نو مسلموں سے لی گئی جن کا تعلق دور دراز کے علاقوں سے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انھیں حضور سے دین سیکھنے کا موقع بھی حاصل نہیں تھا اور ان میں یہ خرابیاں بھی موجود تھیں جن کی نشان دہی اس روایت میں کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو ایک بیعت کا تعلق ہجرت کے زمانے سے ہے اور دوسری کا زمانہ فتح مکہ کے بعد دین کے عمومی فروغ کا دور ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں اس بیعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے مسلمانوں میں شامل ہونے سے پہلے اسے ایک سنجیدہ معاہدے سے گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اسلامی معاشرہ اپنی اعلیٰ اقدار پر پوری شان سے قائم رہے۔

دوسرا پہلو دنیوی سزا کے کفارہ ہونے سے متعلق ہے۔ اگرچہ روایت میں یہی بیان ہوا ہے کہ جس نے دنیا میں اپنے کیے کی سزا پالی یہ سزا اس کے جرم کا کفارہ بن جائے گی۔ لیکن اس پر توبہ کی شرط بہر حال لگی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی مجرم کے دل میں اپنے جرم پر شرمندگی اور اس کی تلافی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا وہ اگرچہ سزا پا بھی لے یہ سزا کفارہ نہیں بن سکتی۔

ضمنی طور پر اس روایت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی مجرم قانون کی گرفت میں نہیں آتا تو وہ بہر حال قیامت کی گرفت سے محفوظ نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ توبہ اور تلافی کی کوشش کرے۔

قرآن سے تعلق

اس روایت میں بیعت کا مضمون جن الفاظ میں آیا ہے وہ بالکل انھی الفاظ میں قرآنِ مجید میں بھی موجود ہے:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.(۶۰:۱۲)

”اے پیغمبر، جب تمھارے پاس مومنہ عورتیں اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور نہ وہ چوری کریں گی اور نہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوں گی اور نہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق کوئی بہتان تراشیں گی اور نہ کسی امر معروف میں تمھاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔“

البتہ اس روایت میں گناہوں کی تلافی کا جو اصول سامنے آتا ہے اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق قرآنِ مجید ہی میں بیان کردہ توبہ و انابت کے اصول سے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کتابیات

بخاری، کتاب الایمان، باب ۱۰، کتاب المناقب، باب ۷۹، کتاب المغازی باب ۹، کتاب تفسیر القرآن، باب ۲۳۴، کتاب الحدود، باب ۸، باب ۱۴، کتاب الدیات، باب ۲، کتاب الفتن، باب ۲، کتاب الاحکام، باب ۴۳، باب ۴۹، کتاب التوحید، باب ۳۱، مسلم، کتاب الحدود، باب ۱۰، کتاب الامارہ، باب ۸، ترمذی، کتاب الحدود، باب ۱۲۔ نسائی کتاب البیعہ، باب ۹، باب ۱۷۔ ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب ۳۳۔ دارمی، کتاب السیر، باب ۱۷۔ اور مسند احمد عن عبادہ بن صامت۔

طالب محسن

عورتوں کو نصیحت

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۹)

وعن ابی سعید الخدری قال: خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی اضحی او فطر الی المصلی. فمر علی النساء. فقال: تصدقن. فانی اریتکن اکثر اہل النار. فقلن: وبم یا رسول اللّٰہ؟ قال: تکثرن اللعن و تکفرن العشیر. مارایت من ناقصات عقل و دین اذھب للب الرجل الحازم من احداکن. قلن: مانقصان دیننا و عقلنا یا رسول اللّٰہ؟ قال الیس شہادۃ المرأۃ مثل نصف شہادۃ الرجل؟ قلن: بلی. قال: فذلک من نقصان عقلھا. قال: الیس اذا حاضت لم تصل ولم تصم؟ قلن: بلی. قال: فذلک من نقصان دینھا.

لغوی بحث

'اریتکن': مجھے تم دکھائی گئی ہو۔ اس جملے میں اس فعل کے تین مفعول ہیں ایک ضمیر متکلم، دوسرے ضمیر مخاطب مؤنث اور تیسرے 'اکثر اہل النار': دوزخ والوں میں زیادہ، پوری ترکیب اس طرح ہے: 'اکثر من اہل النار من الرجال' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مردوں سے زیادہ عورتیں جہنم میں

دکھائی گئیں۔

'بم': یہ اصل میں 'بما' ہے جس کا الف تخفیف کی خاطر حذف کر دیا جاتا ہے۔ 'ما' استفہامیہ ہے اور 'ب' سبب کے معنی میں ہے۔

'اللعن': اس کا اصل مفہوم کسی فرد کا خدا کی ناراضی کی وجہ سے اس کی رحمت سے محروم ہونا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ بد دعا کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

'العشیر': لفظی معنی تو ساتھ رہنے والے کے ہیں، لیکن یہ شوہر کے لیے خاص ہو گیا ہے۔

'من ناقصات عقل و دین': یہاں 'من' بیان کے لیے ہے۔ گویا جار مجرور صفت ہیں اور موصوف محذوف ہے۔ 'ناقصات' کے معنی کمی والیاں ہیں۔

'اذھب': 'ذھب' سے افعل کے وزن پر صفت ہے۔ یہاں یہ زائل کر دینے والے کے معنی میں ہے۔

'فذلک': اس میں کاف پر زبر بھی پڑھی جا سکتی ہے اور زیر بھی۔ زبر تعمیم کے موقع کی مناسبت سے درست ہے اور زیر مخاطب کی رعایت کے مطابق۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ترجمہ

''حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عیدِ اضحیٰ یا عیدِ فطر کے موقع پر عید گاہ کی طرف نکلے۔ (اس موقع پر) آپ عورتوں کے پاس سے بھی گزرے۔ آپ نے فرمایا: اے عورتو، خیرات کیا کرو۔ کیونکہ مجھے جہنم میں تمھیں (یعنی عورتوں کو) زیادہ دکھایا گیا ہے۔ عورتوں نے پوچھا: یا رسول اللہ اس کا سبب کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: تم بہت لعنت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی عقل و دین میں کم بھی ہو اور تم میں سے کسی ایک کی طرح اچھے خاصے بردبار آدمی کی مت بھی مار دے۔ اس پر عورتوں نے وضاحت چاہی کہ اے اللہ کے رسول، یہ عقل اور دین کی کمی سے آپ کی مراد کیا ہے۔ آپ نے (سمجھانے کے لیے عورتوں سے) پوچھا: کیا ایک عورت کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے نصف کے برابر نہیں ہے؟ عورتوں نے جواب دیا: جی، ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ تمھاری عقل کی کمی کے سبب سے ہے۔ پھر آپ نے پوچھا: کیا ایسا نہیں ہے کہ جب کوئی عورت حائضہ ہوتی ہے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے؟ عورتوں نے اس پر بھی وہی جواب دیا: جی ایسا ہی ہے۔ آپ نے کہا: یہ تمھارے دین میں کمی کے سبب سے ہے۔''

متون

ایک روایت میں یہ بھی تصریح ہے کہ عورتوں کو نصیحت کرنے سے پہلے آپ نے جو عید کا خطبہ دیا تھا اس میں بھی بنیادی موضوع کی حیثیت انفاق ہی کو حاصل تھی۔ اس طرح کچھ روایات میں بیان ہوا ہے کہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ نے حضور کی نصیحت سے متاثر ہو کر اپنا زیور خیرات کرنے کا فیصلہ کیا تو ابنِ مسعود نے اس کا سب سے زیادہ مستحق ان کے بیٹے کو قرار دیا۔ ان کی اہلیہ اس بات پر مطمئن نہیں ہوئیں اور حضور کے گھر جا کر ان کی رائے دریافت کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنِ مسعود کی رائے کو درست قرار دیا۔ سب سے حیرت انگیز فرق دارمی کی روایت میں ہے۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ عورتوں کی کمی والی بات حضور نے نہیں خود ابنِ مسعود نے کہی تھی۔

ان کے علاوہ لفظی فرق بھی ہیں۔ مثلاً 'للب' کے بجائے 'لذی لب یا لذوی الالباب ولذوی الرای' بھی آیا ہے۔ اسی طرح 'تکثرن اللعن' کی جگہ 'کثرۃ لعنکن' اور 'شہادۃ المراۃ نصف شہادۃ الرجل' کے بدلے میں 'شہادۃ امراتین تعدل شہادۃ رجل' کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ مزید برآں ایک روایت میں سوال کرنیوالی عورت پر 'فقالت امراۃ منہن جزلۃ یا لیست من علیۃ النساء' کے الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں یہ اضافہ بھی روایت ہوا ہے کہ حضور نے عورتوں کو خیرات کی تلقین کرتے ہوئے 'تصدقن' کے ساتھ 'ولومن حلیکن' یا 'فتقربن الی اللہ ما استطعتن' کے الفاظ بھی بولے تھے۔

معنی

اس روایت میں تین باتیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک یہ کہ لعن طعن اور ناشکر گزاری کے رویے سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ اس طرح کا رویہ اختیار کرنے والا جہنم میں چلا جائے۔ اس روایت میں اگرچہ عورتیں مخاطب ہیں لیکن یہ رویہ اگر مردوں میں بھی ہو تو ان کی نیکیاں بھی برباد ہو جائیں گی۔ دوسرے یہ کہ صدقات یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کی برائیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ زیرِ بحث رویہ در حقیقت دنیا سے لگاؤ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے سے دنیا کی محبت میں کمی آتی اور آخرت اور خدا سے تعلق میں اضافہ ہوتا

ہے۔ تیسری بات ذرا بحث طلب ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایت میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم تر قرار دیا گیا ہے، لیکن یہ تاثر درست نہیں ہے۔ روایت میں جو دو مثالیں دی گئی ہیں، ان کا تعلق عورت کی صلاحیت سے نہیں ہے۔ حیض کی حالت میں نماز نہ پڑھنے اور روزہ نہ رکھنے کی وجہ ایک عارضی اور فطری معذوری ہے۔ اسی طرح گواہی میں دوسری عورت کا ساتھ نفسیاتی سہارے کے لیے ہے جس کا سبب عورتوں کا عمومی دائرۂ عمل اور ماحول ہے نہ کہ کسی صلاحیت کی کمی۔

اصلاً جس چیز کی نشان دہی کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے عورت ہونے کی وجہ سے کچھ مسائل پیش آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مرد کو الجھا لیتی ہیں۔

مزید یہ کہ اگر دارمی کی تصریح درست ہے تو پھر یہ محض ایک صحابی کا ذاتی نقطۂ نظر ہے۔

قرآن سے تعلق

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بنیادی طور پر اس روایت کا موضوع صدقہ وخیرات سے اپنے گناہوں کی تلافی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات قرآن مجید میں بیان کردہ ایک اصول پر مبنی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ. ”بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں۔“

(ہود ۱۱: ۱۱۴)

کتابیات:

بخاری، کتاب الحیض، باب ۶، کتاب الزکوٰۃ، باب ۴۴، کتاب الصوم، باب ۴۰، کتاب الشہادات، باب ۱۲۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۳۴، ترمذی، کتاب الایمان، باب ۳۴، ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، باب ۱۹۔ دارمی، کتاب الطہارہ، باب ۱۰۳ اور مسند احمد، عن عبداللہ بن مسعود، عن عبداللہ بن عمر۔

ساجد حمید

برا خواب دیکھنے کے بعد کی دعا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ.

میں شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

اس دعا سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ برے خواب شیطانی وسوسہ ہوتے ہیں اس لیے جب ایسا خواب دکھائی دے تو اللہ سے ایسے وسوسوں کے معاملے میں پناہ طلب کی جائے۔

رجیم کا لفظ یہاں تلمیح کے طور پر آیا ہے، جس سے روزِ ازل کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب ابلیس کو درگاہِ خداوندی سے نکال دیا گیا۔ اس سے مقصود شیطان کی حیثیت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اس کے متبعین اللہ کے نزدیک رجیم ہیں۔ وہ اس کے ہاں سے کوئی فیضان نہ پا سکیں گے۔ اس لیے جو اس محرومی سے بچنا چاہتا ہے، اسے اس کے وسوسوں اور چالوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔ اور اس مقصد کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔

برے خواب انسان کو پریشان کر دیتے ہیں اور اگر اس کا ایمان اس کا ساتھ نہ دے تو وہ ان کی تعبیر کی برائی سے بچنے کے لیے توحید کی راہ سے بھٹک کر شرک کی طرف نکل سکتا ہے۔

قضاے حاجت کے وقت کی دعا

اَللّٰهُمَّ اِنِّیٓ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ.

اے اللہ، میں خبث اور خبائث سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پرانے زمانے میں (اور آج بھی) دیہاتوں میں شہروں جیسے محفوظ اور باپردہ بیت الخلا نہیں ہوتے تھے۔ مردوں اور عورتوں سب کو کھیتوں یا کھلی جگہوں پر قضاے حاجت کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اور اس مقصد کے لیے، بالعموم رات ہی کو جایا جاتا تھا۔ اس سے برائی میں پڑنے کے امکانات زیادہ ہوتے تھے۔ اس لیے یہ دعا سکھائی گئی کہ میں قضاے حاجت کے لیے جا رہا ہوں تو اے اللہ مجھے تمام گندگیوں اور نجاستوں سے بچا۔ اور اس سے بھی بچا کہ میں کسی بد اخلاقی میں مبتلا ہوں یا لوگوں کے اس طرح کے اعمال سے متاثر ہو کر برائی میں جا پڑوں یا شیاطینِ جن وانس کے وسوسوں میں آجاؤں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ قضاے حاجت کے لیے لوگ کھلی جگہوں پر جاتے تھے اور اس کے لیے انھیں رات کو جانا پڑتا تھا، رات کا وقت جنات کی فتنہ پردازی کے لیے نہایت سازگار ہے، اس لیے ان سے بچنے کے لیے بھی یہ دعا سکھائی گئی ہے۔ قرآنِ مجید میں رات کے چھا جانے اور اس کے شرور سے پناہ کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اس میں بھی اشارہ انھی جنات کی طرف ہے۔

قضاے حاجت جیسے بے لباسی کے موقع پر آدمی کا نفس اگر مزکی نہ ہو تو وہ شیطانی وسوسوں کا جلد شکار ہو سکتا ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کا اسی موقع کے لیے ایک ڈھال کے طور پر ساتھ فراہم کیا ہے کہ آدمی اسے اپنے نفس کو تقویت دینے کے لیے پڑھے۔ یہ چیز یقیناً اسے برے افعال سے بچا لے گی۔ اس لیے کہ خدا کی یاد ہی انسان کے لیے برائیوں سے بچانے کا صحیح اور طاقت ور ذریعہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

اصول و مبادی

(۱۰)

مبادیِ تدبرِ قرآن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۔ سورۂ نساء کی آیات ۱۱- ۱۲ میں تقسیمِ وراثت کا حکم بیان ہوا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جہاں مختلف وارثوں کے حصے بیان فرمائے ہیں، وہاں یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح کر دی ہے کہ وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قرابتِ نافعہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا.(۴:۱۱)

''تم نہیں جانتے کہ تمھارے والدین اور تمھاری اولاد میں سے کون بہ لحاظِ منفعت تم سے قریب تر ہے۔ یہ اللہ کا ٹھیرایا ہوا فریضہ ہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔''

والدین، اولاد، بھائی بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھیرائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو حکم کی یہ علت تقاضا کرتی ہے کہ اسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔ یہ استثنا اگر غور کیجیے تو کہیں باہر سے آکر اس حکم میں داخل نہیں ہوا، اس کی ابتدا ہی سے اس کے ساتھ لگا ہوا ہے، لہٰذا قرآن کا کوئی عالم اگر اسے بیان کرتا ہے تو یہ ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہیں ہے، بلکہ ٹھیک اس

مدعا کی تعبیر ہے جو قرآن کے الفاظ میں مضمر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیشِ نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا:

لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم. (بخاری، کتاب الفرائض)

''نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔''

یعنی اتمامِ حجت کے بعد جب یہ منکرینِ حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

۴۔ سورۂ مائدہ کی آیات ۳۳-۳۴ میں اللہ تعالیٰ نے فساد فی الارض کے مجرموں کی یہ سزا بیان کی ہے کہ انھیں بدترین طریقے سے قتل بھی کیا جا سکتا ہے، سولی بھی دی جا سکتی ہے، ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے بھی جا سکتے ہیں اور انھیں جلاوطن بھی کیا جا سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کا اطلاق اپنے زمانے میں زنا کے بعض عادی مجرموں پر کیا اور فرمایا:

خذوا عنی، خذوا عنی، قد جعل اللہ لھن سبیلاً. البکر بالبکر جلد مائة ونفی سنة والثیب بالثیب جلد مائة والرجم. (مسلم، کتاب الحدود)

''مجھ سے لو، مجھ سے لو، زنا کی ان عادی عورتوں کے بارے میں اللہ نے جو راہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا، وہ اس نے نکال دی۔ اس طرح کے مجرم اگر کنوارے یا الھڑ ہوں تو ان کی سزا سو کوڑے اور جلا وطنی ہے اور رنڈوے یا شادی شدہ ہوں تو سو کوڑے اور سنگ ساری ہے۔''

آپ کا منشا یہ تھا کہ یہ عورتیں چونکہ محض زنا ہی کی مجرم نہیں ہیں، بلکہ اس کے ساتھ آوارہ منشی اور جنسی بے راہ روی کو اپنا معمول بنا لینے کی وجہ سے فساد فی الارض کی مجرم بھی ہیں، اس لیے ان میں سے جو اپنے حالات کے لحاظ سے رعایت کی مستحق ہیں، انھیں زنا کے جرم میں سورۂ نور کی آیت ۲ کے تحت سو کوڑے اور معاشرے کو ان کے شر و فساد سے بچانے کے لیے ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ کی آیت ۳۳ کے تحت نفی، یعنی جلاوطنی کی سزا دی جائے۔ اسی طرح جنھیں کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے، وہ اس آیت کے حکم 'ان یقتلوا' کے تحت

رجم[۲۶] کر دی جائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی قرآن کے مدعا میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام ٹھیرائی ہیں، اُن میں سے ایک 'میتة' یعنی مردار بھی ہے۔ عربی زبان کے اسالیب سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ اس کا ایک لغوی مفہوم بھی ہے اور یہ عرف و عادت کی رعایت سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ ہر اُس چیز کے لیے مستعمل ہے جس پر موت وارد ہو گئی ہو لیکن دوسری صورت میں عربیت سے آشنا کوئی شخص اسے مثال کے طور پر مردہ ٹڈی یا مردہ مچھلی کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فرمایا ہے:

احلت لکم میتتان ودمان، فاما المیتتان فالحوت والجراد واما الدمان فالکبد والطحال[۲۷]. (ابن ماجہ، کتاب الاطعمہ)

"تمھارے لیے دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون حلال ہیں: مری ہوئی چیزیں مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون جگر اور تلی ہیں۔"

امام اللغۃ زمخشری لکھتے ہیں:

فان قلت: فی المیتات ما یحل وھو السمک والجراد وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: احلت لنا میتتان ودمان، قلت: قصد ما یتفاھمہ الناس ویتعارفونہ فی العادۃ، الا تری ان القائل اذا قال: اکل فلان میتة، لم یسبق الوھم الی السمک والجراد کما لو قال: اکل دماً، لم

"پھر اگر تم سوال کرو گے کہ مری ہوئی چیزوں میں سے تو کچھ ہمارے لیے حلال بھی ہیں، جیسے مچھلی اور ٹڈی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ہمارے لیے دو مری ہوئی چیزیں اور دو خون حلال کیے گئے تو ہم جواب میں کہیں گے: قرآن میں لفظ 'میتة' عرف و عادت کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کوئی کہنے والا کہتا ہے: فلاں نے مردار کھایا، تو ہمارا

۲۶۔ روایت میں اس کے ساتھ سو کوڑے کی سزا کا ذکر بھی ہوا ہے، لیکن یہ محض قانون کی وضاحت کے لیے ہے۔ موت کے ساتھ کوئی دوسری سزا اگر ہو تو اسے قانون، فیصلے یا حکم میں بیان تو کیا جاتا ہے لیکن عملاً کبھی نافذ نہیں کیا جاتا۔

۲۷۔ یہ روایت اگرچہ حدیث کی امہاتِ کتب، بخاری و مسلم اور موطا امام مالک میں اس طرح نہیں آئی لیکن اس کا مضمون اصلاً ان کتابوں میں بھی موجود ہے۔

يسبق الى الكبد والطحال، ولاعتبار العادة والتعارف قالوا من حلف لاياكل لحما فاكل سمكا لم يحنث وان اكل لحما فى الحقيقة.

(الکشاف، ج ۱، ص ۲۱۵)

خیال کبھی مچھلی یا ٹڈی کی طرف نہیں جاتا، جس طرح اگر اس نے کہا ہوتا: فلاں شخص نے خون پیا، تو ذہن کبھی جگر اور تلی کی طرف منتقل نہ ہوتا۔ چنانچہ عرف و عادت ہی کی بنا پر فقہا نے کہا ہے کہ جس نے قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا، پھر اس نے مچھلی کھا لی تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، دراں حالیکہ اس نے فی الحقیقت گوشت ہی کھایا ہے۔''

۶۔ چوری کی سزا قرآنِ مجید کی سورۂ مائدہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.(۵:۳۸)

''اور چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، اُن کے عمل کی پاداش اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا کے طور پر اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔''

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا چور مرد اور چور عورت کے لیے ہے۔ قرآن نے اس کے لیے 'سارق' اور 'سارقة' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عربی زبان کا ہر عالم جانتا ہے کہ یہ صفت کے صیغے ہیں جو وقوعِ فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں، لہٰذا ان کا اطلاق فعلِ سرقہ کی کسی ایسی ہی نوعیت پر کیا جا سکتا ہے جس کے ارتکاب کو چوری اور جس کے مرتکب کو چور قرار دیا جا سکے۔ چنانچہ کوئی بچہ اگر اپنے باپ یا کوئی عورت اپنے شوہر کی جیب سے چند روپے اڑا لیتی ہے یا کوئی شخص کسی کی بہت معمولی قدر و قیمت کی کوئی چیز چرا لے جاتا ہے یا کسی کے باغ سے کچھ پھل یا کسی کے کھیت سے کچھ سبزیاں توڑ لیتا ہے یا بغیر کسی حفاظت کے کسی جگہ ڈالا ہوا کوئی مال اچک لیتا ہے یا آوارہ چرتی ہوئی کوئی گائے یا بھینس ہانک کر لے جاتا ہے یا کسی اضطرار اور مجبوری کی بنا پر اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کرتا ہے تو بے شک، یہ سب ناشایستہ افعال ہیں اور ان پر اسے تادیب و تنبیہ بھی ہونی چاہیے، لیکن یہ وہ چوری نہیں ہے جس کا حکم ان آیات میں بیان ہوا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن کے اسی مدعا کا بیان ہے:

لا قطع فی ثمر معلق ولا فی حریسة جبل فاذا اواه المراح اوالجرین فالقطع فیما یبلغ ثمن المجن.(مؤطا، کتاب الحدود)

''میوہ درخت پر لٹکتا ہو یا بکری پہاڑ پر چرتی ہو اور کوئی اسے چرا لے تو اس میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ اگر وہ کھلیان میں آ جائے اور وہ باڑے میں پہنچ جائے تو ہاتھ کاٹا جائے، بشرطیکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو۔''

اس میں بھی دیکھ لیجیے، شرح و بیان کے حدود سے سرِ مو کوئی انحراف نہیں ہوا۔

(باقی)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ معیشت

(۶)

۷۔ تقسیمِ وراثت

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ. فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (البقرہ ۲: ۱۸۰-۱۸۲)

”تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر لازم ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرو، خدا سے ڈرنے والوں پر یہ حق ہے، پھر جو اِس وصیت کو اِس کے سننے کے بعد بدل ڈالے تو اِس کا گناہ اُن بدلنے والوں پر ہی ہو گا، بے شک اللہ سمیع و علیم ہے۔ جس کو البتہ، کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو اور وہ آپس میں صلح کرا دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔“

سورۂ نساء میں تقسیمِ وراثت کی جو آیات اس کے بعد زیرِ بحث آئیں گی، ان میں حصوں کی تعیین اور مصحف میں ان کی جگہ صاف بتاتی ہے کہ والدین اور قرابت مندوں کے لیے معروف کے مطابق وصیت کا یہ حکم اُس وقت نازل ہوا جب وہ آیات ابھی نازل نہیں ہوئی تھیں۔ نساء کی اُن آیات میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میت کے ترکہ میں والدین اور اقربا کے حصے اس لیے متعین فرمائے ہیں کہ انسان نہیں جانتا کہ

ان میں سے کون بہ لحاظِ منفعت اس سے قریب تر ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں ان حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ہے جس کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے، لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ سورۂ بقرہ کی اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا ہے، لیکن یہ جب دیا گیا تو اس سے کیا چیز پیشِ نظر تھی؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

> ''اس آیت میں والدین اور اقربا کے لیے جو وصیت کا حکم دیا گیا، وہ معروف کے تحت تھا اور اس عبوری دور کے لیے تھا جب کہ اسلامی معاشرہ ابھی اس استحکام کو نہیں پہنچا تھا کہ تقسیمِ وراثت کا وہ آخری حکم دیا جائے جو سورۂ نساء میں نازل ہوا۔ اس حکم کے نزول کے لیے حالات کے سازگار ہونے سے پہلے یہ عارضی حکم نازل ہوا اور اس سے دو فائدے پیشِ نظر تھے: ایک تو فوری طور پر ان حصہ داروں کے حقوق کا ایک حد تک تحفظ جن کے حقوق عصبات کے ہاتھوں تلف ہو رہے تھے، اور دوسرے اس معروف کو از سرِ نو تازہ کرنا جو شرفائے عرب میں زمانۂ قدیم سے معتبر تھا، لیکن اب وہ آہستہ آہستہ جاہلیت کے گرد و غبار کے نیچے دب چلا تھا تاکہ یہ معروف اس قانون کے لیے ذہنوں کو ہموار کر سکے جو اس باب میں نازل ہونے والا تھا۔''
>
> (تدبرِ قرآن، ج۱ ص ۴۳۹-۴۴۰)

۲۔ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ. (النساء ۴:۱۱)

> ''تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔ پھر اگر اولاد میں لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زیادہ ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔''

سورۂ نساء میں تقسیمِ وراثت کا یہی حکم ہے جس سے اوپر کی آیت منسوخ ہوئی ہے۔ اس میں سب سے پہلے اولاد کے حصے بیان ہوئے ہیں۔

'یوصیکم اللہ فی اولادکم' یہ جملہ 'للذکر مثل حظ الانثیین' کے لیے بطورِ تمہید آیا ہے۔ 'اولاد' کا لفظ ظاہر ہے کہ مرد و عورت دونوں کے لیے عام ہے۔ چنانچہ تالیفِ کلام اس طرح ہو گی: 'للذکر منھم مثل حظ الانثیین'، یعنی اللہ تم کو تمھاری اولاد کے بارے میں ہدایت کرتا ہے، ان میں سے لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا۔

یہ حکم اگر 'للذکر مثل حظ الانثیین' ہی پر ختم ہو جاتا تو اس کے معنی یہ تھے:

۱۔ مرنے والے کی اولاد میں اگر ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہی ہو تو لڑکے کو لڑکی کا دونا ملے گا۔

۲۔ لڑکے اور لڑکیاں اس سے زیادہ ہوں تو میت کا ترکہ اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ ہر لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رہے۔

۳۔ اولاد میں صرف لڑکے یا لڑکیاں ہی ہوں تو سارا ترکہ دونوں میں سے جو موجود ہو گا، اسے دیا جائے گا۔

یہ تیسری بات بھی صاف واضح ہے کہ اس اسلوب کا لازمی تقاضا ہے۔ ہم اگر اپنی زبان میں یہ کہیں کہ یہ رقم فقیروں کے لیے ہے اور اس میں سے فقیر مرد کا حصہ دو فقیر عورتوں کے برابر ہو گا تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ رقم در حقیقت فقیروں کے لیے دی گئی ہے، لہٰذا ان میں اگر فقیر مرد ہی ہوں گے تو ساری رقم ان میں تقسیم کر دی جائے گی اور فقیر عورتیں ہی ہوں گی تو پھر بھی یہی کیا جائے گا۔ لیکن حکم یہاں ختم نہیں ہوا، بلکہ اس سے متصل ایک استثنا کے ذریعے سے قرآن نے وضاحت کر دی ہے کہ اس کا منشا یہ نہیں ہے۔

'فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک' یہ 'للذکر مثل حظ الانثیین' سے استثنا ہے۔ یعنی مرنے والے کی اولاد میں اگر لڑکیاں ہی ہوں تو خواہ دو ہوں یا دو سے زائد، ان کا حصہ ہر حال میں دو تہائی ہی ہو گا۔

'وان کانت واحدۃ فلھا النصف' یہ اسی پر عطف ہوا ہے۔ یعنی اگر ایک ہی لڑکی ہے تو وہ نصف کی حق دار ہو گی۔

'فوق اثنتین' کا مفہوم ہم نے اوپر دو یا دو سے زائد بیان کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے ہمارے نزدیک 'اثنتین' کا لفظ عربیت کی رو سے محذوف ہے۔ قرآن کی زبان میں اگر ہم ایک لڑکی اور دو یا دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ ان کے حصوں میں فرق کی وجہ سے الگ الگ بیان کرنا چاہیں تو اس کے دو طریقے ہیں: ترتیبِ صعودی کے مطابق بیان کرنا پیشِ نظر ہو تو پہلے ایک لڑکی اور اس کے بعد دو لڑکیوں کا حصہ بیان کیا جائے گا۔ دو سے زائد کا حصہ اگر وہی ہے جو دو کا ہے تو اسے لفظوں میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک کے فوراً بعد جب دو کا حصہ اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ایک کے حصے سے زیادہ ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دو سے زائد کا حکم بھی وہی ہے جو دو لڑکیوں کا ہے۔ اسی بات کو ہم ترتیبِ نزولی کے مطابق بیان کریں گے تو اس کے لیے 'فوق اثنتین او اثنتین' کے الفاظ چونکہ عربیت کی رو سے موزوں نہ ہوں گے، اس لیے دو سے

زائد کا حصہ بیان کرنے کے بعد ایک کا حصہ بیان کر دیا جائے گا۔ اس اسلوب میں 'فوق اثنتین' سے کلام کا آغاز خود دلیل ہو گا کہ اس سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ محذوف ہے۔ غور کیجیے تو اس کا قرینہ بالکل واضح ہے اس ترتیب کا حسن مقتضی ہے کہ 'فوق اثنتین' سے پہلے 'اثنتین' کا لفظ استعمال نہ کیا جائے اور صحتِ زبان کا تقاضا ہے کہ 'فوق اثنتین' سے بات شروع کی جائے تو بعد میں 'اثنتین' مذکور نہ ہو۔ قرآنِ مجید نے یہ حصے یہاں ترتیبِ نزولی کے مطابق بیان کیے ہیں، اس لیے حذف کا یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ سورۂ نساء کی آخری آیت میں یہی حصے ترتیبِ صعودی کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجیے، وہاں 'اثنتین' کے بعد 'فوق اثنتین' کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے: 'ان امرو هلک ليس له ولد وله اختفلها نصف ما ترک وهو يرثها ان لم يکن لها ولد، فان کانتا الثنتين فلهما الثلثان مما ترک'[۴۹]۔

وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ. (النساء ۴:۱۱)

"اور اگر میت کے اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے ترکے کا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کا حصہ ایک تہائی ہے، اور اگر اس کے بہن بھائی ہوں تو ماں کے لیے وہی چھٹا حصہ ہے، جب کوئی وصیت جو مرنے والے نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض اگر اس نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔"

اولاد کے بعد یہ اب والدین کے حصے بیان ہوئے ہیں۔

'ولا بويه لکل واحد منهما السدس مما ترک'، یہ جملہ 'فان کن نساء' اور 'وان کانت واحدة' پر نہیں، بلکہ اس پورے حکم پر عطف ہوا ہے جو اوپر اولاد کے لیے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس میں عطف اب جمع کے لیے نہیں ہو گا، اسے استدراک ہی کے لیے مانا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'للذکر مثل حظ الانثيين' میں یہ بات تو بیان ہوئی ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو گا، لیکن یہ کتنا ہو گا، اسے متعین نہیں کیا گیا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے، جس طرح مثال کے طور پر ہم اپنی زبان میں یہ کہیں کہ — "یہ روپے بچوں کے لیے ہیں، لڑکوں کو لڑکیوں سے دو نا دیجیے، اور اس میں سے آدھی رقم آپ کے ابا کے لیے ہے" —

۴۹۔ ۴:۱۷۶۔

ان جملوں کو دیکھیے، ان سے قائل کا مدعا بالکل واضح ہے۔ جو شخص بھی زبان آشنا ہوگا، وہ ان سے یہی مطلب سمجھے گا کہ روپے درحقیقت بچوں کے لیے دیے گئے ہیں، اس لیے بات اگر پہلے دو جملوں ہی پر ختم ہو جاتی تو ساری رقم لڑکوں اور لڑکیوں میں اسی نسبت سے تقسیم کر دی جاتی جو ان جملوں میں بیان ہوئی ہے، لیکن قائل نے اس کے بعد چونکہ آدھی رقم ابا کو دینے کے لیے کہا ہے، اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ابا کا حصہ پہلے دیا جائے اور باقی جو کچھ بچے، وہ اس کے بعد بچوں میں تقسیم کیا جائے۔ ہم نے اوپر اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ 'فان کن نساء'، 'للذکر مثل حظ الانثیین' سے استثنا اور اسی کے ایک پہلو کی وضاحت ہے۔ ہماری یہ بات اگر صحیح ہے تو اسے پھر 'ولابویه' کی طرح اپنے مقام پر مستقل نہیں مانا جا سکتا۔ اس کا حکم وہی ہونا چاہیے جو 'للذکر مثل حظ الانثیین' کا ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے، جس طرح مثلاً ہم یہ کہیں کہ ـــ ''یہ ساری رقم زید، عثمان اور علی کے لیے ہے اور اس میں ان کا حصہ بالکل برابر ہے، لیکن اگر عثمان اور علی ہی ہوں تو پوری رقم کا دو تہائی عثمان اور ایک تہائی علی کو دیجیے، اور اس میں سے دس روپے ہماری بہن کو دے دیجیے گا۔'' ـــ ان جملوں پر غور کیجیے، ان میں اگرچہ زید کی عدم موجودگی میں عثمان اور علی کو بالترتیب پوری رقم کا دو تہائی اور ایک تہائی دینے کے لیے کہا گیا ہے، لیکن ان کے خاتمہ پر جو استدراک ہوا ہے، اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس رقم میں سے پہلے دس روپے بہن کو دیے جائیں، اور اس کے بعد جو کچھ بچے، وہ عثمان اور علی میں ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

یہی اسلوب آیۂ زیر بحث میں بھی ہے۔ چنانچہ یہ اگر ملحوظ رہے تو اس بات کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی کہ 'وان کانت واحدة فلها النصف' کے بعد والدین اور زوجین کے جو حصے حرف 'و' سے اولاد کے حصوں پر عطف ہوئے ہیں، وہ سب لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہوگا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو انھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے لیے بھی یہی قاعدہ ہوگا۔ اسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں بھی اس بچے ہوئے ترکے ہی کا دو تہائی یا آدھا دیا جائے گا، ان کے حصے پورے ترکے میں سے کسی حال میں ادا نہ ہوں گے۔

آیت کا صحیح مدعا یہی ہے۔ جو شخص بھی 'ولابویه' میں حرف 'و' اور 'فان کن نساء' میں حرف 'ف' کی دلالت کو سمجھتے ہوئے اس آیت کو پڑھے گا، کلام کا یہ مدعا بغیر کسی تکلف کے اس پر واضح ہو جائے گا۔

اس کے بعد اب آیت کا باقی حصہ دیکھیے:

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

'ان کان له ولد' اور 'فان لم یکن له ولد' میں 'ولد' کا لفظ ذکور و اناث دونوں کے لیے عام ہے۔ عربی زبان میں یہ اس معنی میں معروف ہے۔ یہ لفظ یہاں اور ازواج کے حصوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر جگہ اس کا مفہوم یہی ہے۔ اہلِ لغت بالصراحت کہتے ہیں کہ: 'هو یقع علی الواحد والجمع والذکر والانثی'، ان آیات میں اسے اولادِ ذکور کے لیے خاص کرنے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ لڑکا لڑکی ایک ہوں یا دو، اولاد میں صرف لڑکے ہوں یا صرف لڑکیاں ہوں، نفی و اثبات میں اس شرط کا اطلاق بہر حال ہو گا۔

'فلامه الثلث' کے بعد عربیت کے قاعدے کے مطابق 'ولابیه الثلثان' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اس محذوف کا قرینہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید نے اس تقسیم کے لیے 'وورثه ابواه' کی شرط عائد کی ہے۔ اس طرح یہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ــــ ''اس رقم کے وارث زید اور علی ہی ہوں تو زید کا حصہ ایک تہائی ہو گا۔'' ــــ تو اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ــــ ''باقی دو تہائی علی کے لیے ہے۔''

'فان کان له اخوة فلامه السدس' کے بعد بھی ہمارے نزدیک 'ولابیه' یا اس کے ہم معنی الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ اس کا قرینہ بھی بالکل واضح ہے۔ بھائی بہن موجود ہوں تو ماں کا حصہ وہی ہے جو اوپر اولاد کی موجودگی میں بیان ہوا ہے۔ یہ مذکور اس بات پر خود دلیل ہے کہ باپ کا حصہ بھی وہی ہونا چاہیے۔ اس کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پڑھنے والا قرآن کی زبان کا ذوق رکھتا ہو تو بغیر کسی تکلف کے سمجھ لے گا کہ ماں کا حصہ اصل کی طرف لوٹ گیا ہے تو باپ کا حصہ خود بخود لوٹ جائے گا۔

اس کلام کی تالیف اس طرح ہے۔

> ''اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے ۱/۶ ہے۔ اولاد نہ ہو اور والدین ہی وارث ہوں تو ماں کے لیے ۱/۳، لیکن اگر بھائی بہن ہوں تو ماں کے لیے وہی ۱/۶۔''

دیکھ لیجیے، کلام خود پکار رہا ہے کہ ــــ ''اور باپ کے لیے بھی وہی ۱/۶۔''

اس حکم سے واضح ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے بہن بھائیوں کو ان کا قائم مقام ٹھیرایا ہے۔ ہماری اس رائے کی تائید اسی سورہ کی آخری آیت سے بھی ہوتی ہے، لیکن اس کی وضاحت ہم آگے اس کے محل میں کریں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

'اخوۃ' کا لفظ اس آیت میں ہمارے نزدیک محض وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ بھائی بہنوں کی موجودگی میں، عام اس سے کہ وہ ایک ہوں یا دو یا دو سے زیادہ ہوں، والدین کا حصہ اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔ اس طرح کے اسلوب میں جمع بیانِ عدد کے لیے نہیں، محض بیانِ وجود کے لیے آتی ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے:

ایاک والامر الذی ان توسعت　　　مواردۃ ضاقت علیک المصادر

"اس معاملے سے بچو جس میں داخل ہونے کے راستے اگر کشادہ ہیں تو نکلنے کی راہیں تنگ ہوں۔"

شاعر نے یہاں 'موارد' اور 'مصادر' کے الفاظ جمع استعمال کیے ہیں۔ بڑا ستم کرے گا وہ شخص جو اس کا مفہوم یہ بیان کرے کہ اس شعر میں اس معاملے سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے جس کے موارد اور مصادر بہر حال تین یا تین سے زیادہ ہوں۔ اس شعر سے معاملے میں مورد و مصدر کا وجود تو بے شک، ثابت ہوتا ہے، لیکن یہ واضح ہے کہ ان کی تعداد کا تعین شاعر کے پیشِ نظر ہی نہیں ہے۔ کسی معاملے میں ہاتھ ڈالنے اور اس سے الگ ہو جانے کا طریقہ ایک بھی ہو سکتا ہے اور یہ طریقے دس بیس بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح مرنے والا اپنے پیچھے ایک بھائی یا بہن چھوڑ کر بھی رخصت ہو سکتا ہے اور اس کے بہن بھائی پانچ دس بھی ہو سکتے ہیں۔ 'اخوۃ' کا لفظ ان سب صورتوں کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اس مفہوم کے لیے جمع کا یہ اسلوب ہر زبان میں عام ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ ــــ "آپ کے ہاں بچے ہوں تو یہ مٹھائی ان کو دے دیجیے گا۔" ــــ تو کوئی شخص اس سے یہ مراد نہیں لے گا کہ اگر مخاطب کے ایک ہی بچہ ہو تو چونکہ متکلم نے لفظ "بچے" جمع استعمال کیا ہے، اس لیے وہ کسی حال میں مٹھائی کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ اس جملے کا یہ مطلب وہی شخص لے سکتا ہے جو زبان کو اسالیبِ بیان کے بجائے منطق اور ریاضی کے اصولوں سے سمجھتا ہو۔

'من بعد وصیۃ یوصی بھا اودین' حکم کے آخر میں اس ہدایت کا منشا یہ ہے کہ اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اس کے ترکے میں سے وہ دیا جائے گا پھر اگر کوئی وصیت مرنے والے نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہو گی۔ آیت میں قرض اگرچہ لفظاً موخر ہے، لیکن حکم کے لحاظ سے اسے مقدم ہی مانا جائے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرض خواہ کا حق مرنے والے کی زندگی ہی میں قائم ہو جاتا ہے اور جن کے لیے وصیت کی گئی ہے، ان کا حق مورث کی موت سے پہلے قائم نہیں ہوتا۔ رہی آیت میں وصیت کی تقدیم تو یہ محض حسنِ بیان کے لیے ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۴۔ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (النساء ۴:۱۱)

''تم نہیں جانتے کہ تمھارے والدین اور تمھاری اولاد میں سے کون بہ لحاظِ منفعت تم سے قریب تر ہے۔ یہ اللہ کا ٹھیرایا ہوا فریضہ ہے، بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔''

سلسلۂ کلام کے بیچ میں یہ آیت جس مقصد کے لیے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ جن رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے کسی میت کے وارث قرار دیا ہے، ان کے بارے میں مبنی بر انصاف قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرمادیا ہے۔ چنانچہ اس کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھیرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا۔ یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے ہر حکم میں گہری حکمت ہے اور اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان اپنی بلند پروازیوں کے باوجود اس کے علم کی وسعتوں کو پاسکتا ہے اور نہ اس کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ اگر بندۂ مومن ہے تو اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور اس کے سامنے سر جھکا دے۔

آیت کا اصل مدعا یہی ہے، لیکن اگر غور کیجیے تو اس سے یہ بات بھی نہایت لطیف طریقے سے واضح ہو گئی ہے کہ وراثت کا حق جس بنیاد پر قائم ہوتا ہے، وہ قرابتِ نافعہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ والدین، اولاد، بھائی بہن، میاں بیوی اور دوسرے اقربا کے تعلق میں یہ منفعت بالطبع موجود ہے اور عام حالات میں یہ اسی بنا پر بغیر کسی تردد کے وارث ٹھیرائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی اگر اپنے مورث کے لیے منفعت کے بجائے سراسر اذیت بن جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علتِ حکم کا یہ بیان تقاضا کرتا ہے کہ اسے وراثت سے محروم قرار دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے پیشِ نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا:

لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم. (بخاری، کتاب الفرائض)

''نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔''

یعنی اتمامِ حجت کے بعد جب یہ منکرینِ حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح یہ رہنمائی بھی ضمناً اس آیت سے حاصل ہوتی ہے کہ ترکے کا کچھ حصہ اگر بچا ہوا رہ جائے اور مرنے والے نے کسی کو اس کا وارث نہ بنایا ہو تو اسے بھی 'اقرب نفعاً' ہی کو ملنا چاہیے۔

مسلم، کتاب الفرائض کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات فرمائی ہے:

الحقوا الفرائض باھلھا، فما ترکت الفرائض فھو لا ولی رجل ذکر۔ ''وارثوں کو ان کا حصہ دو پھر اگر کچھ بچے تو وہ قریب ترین مرد کے لیے ہے۔''

۵۔وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ.(النساء۴:۱۲)

''اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا نصف تمھیں ملے گا، اگر ان کے اولاد نہیں ہے، اور اگر وہ صاحبِ اولاد ہیں تو ترکے کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو ان کے ذمہ ہو، وہ ادا کر دیا جائے اور ان کے لیے تمھارے ترکے کا چوتھائی ہے، اگر تمھارے اولاد نہیں ہے اور اگر اولاد ہو تو تمھارے ترکے کا آٹھواں حصہ ان کا ہے، جب کہ وصیت جو تم نے کی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو تم نے چھوڑا ہو، وہ ادا کر دیا جائے۔''

یہ زوجین کے حصے ہیں اور ہر لحاظ سے واضح ہیں، ان میں لفظ و معنی کے اعتبار سے کوئی مشکل نہیں ہے۔ 'ولابویه' پر عطف کی وجہ سے مرنے والے کی وصیت کی تعمیل اور اس کا قرض ادا کر دینے کے بعد والدین کے حصوں کی طرح یہ حصے بھی پورے ترکے میں سے دیے جائیں گے۔

۶۔وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ.(النساء۴:۱۲)

''اور اگر کسی مرد یا عورت کو اس کے کلالہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہے تو بھائی اور بہن، ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہائی میں سب شریک ہوں گے، جب کہ وصیت جو کی گئی ہو، وہ پوری کر دی جائے اور قرض جو ہو، وہ ادا کر دیا جائے، بغیر کسی کو ضرر

پہنچائے۔ یہ وصیت ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علیم و حلیم ہے۔"

اولاد، والدین اور زوجین کے بعد اب یہ دوسرے قرابت مندوں سے متعلق ہدایت فرمائی ہے۔

'کلالۃ' اس آیت میں اہم ترین لفظ ہے۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ 'کلال' یعنی ضعف و عجز کے معنی میں مصدر ہے۔ اعشیٰ کا مصرع ہے:

فآلیت لا ارثی لھا من کلالۃ

"تب میں نے قسم کھائی کہ میں اس پر اس کے ضعف و عجز کی وجہ سے رحم نہ کروں گا۔"

متمم بن نویرہ کہتا ہے:

فکانھا بعد الکلالۃ والسری علج تخالیہ قذور ملمع

"وہ اونٹنی رات کے سفر اور تھکاوٹ کے بعد گویا وہ جنگلی گدھا ہے جس سے گابھن گدھی بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

باعتبارِ مجاز ائمہ لغت نے بالعموم اس کے تین معنی بیان کیے ہیں:

ایک وہ شخص جس کے پیچھے اولاد اور والد دونوں میں سے کوئی نہ ہو،

دوسرے وہ قرابت جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو،

تیسرے کسی شخص کے وہ رشتہ دار جن کا تعلق اس کے ساتھ اولاد اور والد کا نہ ہو۔

زمخشری "الکشاف" میں لکھتے ہیں:

ینطلق علی ثلاثۃ: علی من لم یخلف ولدا ولا والدا وعلی من لیس بولد ولا والد من المخلفین وعلی القرابۃ من غیر جھۃ الولد والوالد. ومنہ قولھم: ماورث المجد عن کلالۃ کما تقول: ما صمت عن عی وما کف عن جبن. والکلالۃ فی الاصل مصدر بمعنی الکلال وھو

"کلالہ کے تین معنی ہیں: یہ اس شخص کے لیے اسمِ صفت ہے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو اور ان پس ماندگان کے لیے بھی جن کا تعلق مرنے والے سے اولاد اور والد کا نہ ہو۔ اس کا اطلاق اس قرابت پر بھی ہوتا ہے جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں: 'ماورث المجدعن کلالۃ' (وہ دور کے تعلق سے بزرگی کا وارث نہیں ہوا)۔ اسی طرح تم

ذهاب القرة من الاعیاء، قال الاعشٰی: فآلیت لا ارثی لھا من کلالة، فاستعیرت للقرابة من غیر جھة الولد والوالد لانھا بالاضافة الی قرابتھما کآلة ضعیفة واذا جعل صفة للموروث او الوارث فبمعنی ذی کلالة کما تقول: فلان من قرابتی، ترید فلان من ذوی قرابتی ویجوزان یکون صفة کالھجاجة والفقاقة للاحمق.(ج۱ص۴۸۵)

کہتے ہو: 'ماصمت عن عیّ' (وہ گفتگو میں عاجز رہ جانے کی وجہ سے خاموش نہیں ہوا) اور 'ماکف عن جبن' (وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں رکا)۔ اور کلالہ اصل میں بمعنی 'کلال' مصدر ہے اور 'کلال' کے معنی ہیں: عجز کی وجہ سے قوت کا جاتے رہنا۔ اعشٰی کا مصرع ہے: 'فآلیت لا ارثی لھا من کلالة' (تب میں نے قسم کھائی کہ میں اس پر اس کے ضعف و عجز کی وجہ سے رحم نہ کروں گا)۔ پھر یہ مجازی طور پر اس قرابت کے لیے مستعمل ہوا جو والد اور اولاد کی طرف سے نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قرابت اس قرابت کی نسبت ضعیف ہے جو والد اور اولاد کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور اسے جب مورث یا وارث کے لیے صفت قرار دیا جاتا ہے تو یہ 'ذو کلالة' کے معنی میں ہوتا ہے۔ اسی طریقے پر تم 'فلان من قرابتی' یعنی 'فلان من ذوی قرابتی' بولتے ہو اور یہ 'ھجاجة' اور 'فقاقة' بمعنی احمق کی طرح اسم صفت بھی ہو سکتا ہے۔''

پہلے معنی، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، اس کا استعمال اگرچہ اصولِ عربیت کے مطابق ہے، لیکن اس کی کوئی نظیر کلامِ عرب میں ہم کو نہیں مل سکی۔ دوسرے معنی، یعنی اس قرابت کے لیے جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو، اس کے استعمال کے نظائر کلامِ عرب میں عام ہیں۔

طرماح کہتا ہے:

یھزسلا حالم یرثه کلالة　　　یشک به منھا غبوض المغابن

"وہ اپنا ہتھیار ہلاتا ہے جس کا وارث وہ دور کے تعلق سے نہیں ہوا۔ وہ اس سے اس کی رانوں کے چھپے ہوئے حصے کو چھید ڈالتا ہے"

عامر بن طفیل کا مصرع ہے:

وما سودتنی عامر عن کلالة

"اور قبیلۂ عامر نے مجھے دور کے تعلق کی وجہ سے سردار نہیں بنایا۔"

لسان العرب میں ہے:

والعرب تقول، لم یرثه کلالة ای لم یرثه عن عرض، بل عن قرب واستحقاق.(ج١١، ص٥٩٢)

"عرب کہتے ہیں: 'لم یرثه کلالة' یعنی وہ دور کے تعلق سے وارث نہیں ہوا، بلکہ اس نے وراثت قرب واستحقاق کی وجہ سے پائی ہے۔"

تیسرے معنی، یعنی کسی شخص کے ان رشتہ داروں کے لیے جن کے ساتھ اس کا تعلق اولاد اور والد کا نہ ہو، اس کا استعمال قطعی شواہد سے ثابت ہے:

حماسی شاعر یزید بن الحکم الثقفی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

والمرء یبخل بالحقوق وللکلالة مایسیم

"انسان حقوق ادا کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے جنگل میں چرنے والے جانور دور کے رشتہ دار لے جاتے ہیں۔"

ازہری نے ایک شاعر کا شعر نقل کیا ہے:

فان اباء المرءاحمی له ومولی الکلالة لا یغضب

"آدمی پر ظلم کیا جائے تو اس کی حمایت میں اس کا باپ ہی سب سے بڑھ کر غضب ناک ہوتا ہے۔ کلالہ رشتہ دار آدمی کے لیے اس کے باپ کی طرح غضب ناک نہیں ہوتے۔"

ایک اعرابی کا قول ہے:

مالی کثیر و یرثنی کلالة متراخ نسبهم.(لسان العرب، ج١١، ص٥٩٢)

"میرے پاس مال بہت زیادہ ہے اور میرے وارث دور کے رشتہ دار ہیں۔"

امام مسلم نے جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

يا رسول الله، انما يرثني كلالة. (کتاب الفرائض، باب ۲)

''اے اللہ کے رسول، میرے وارث صرف کلالہ ہیں۔''

بہت سی تفسیری روایتوں میں بھی یہ معنی بیان ہوئے ہیں۔ ابو بکر جصاص ''احکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

وروی عن ابی بکر الصديق وعلى وابن عباس فى احدى الروايتين ان الكلالة ماعدا الوالد والوالد وروى محمد بن سالم عن شعبي عن ابن مسعود انه قال: الكلالة ما خلا الوالد والولد، وعن زيد بن ثابت مثله. (ج ۲، ص ۸۷)

''سیدنا ابو بکر صدیق، سیدنا علی اور حضرت ابنِ عباس سے اس باب میں جو دو روایتیں ہیں، ان میں سے ایک میں ہے کہ باپ اور اولاد کے سوا سب کلالہ ہیں۔ اور محمد بن سالم نے شعبی سے اور انھوں نے حضرت ابنِ مسعود سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: باپ اور اولاد کے سوا سب کلالہ ہیں۔ اور حضرت زید بن ثابت سے بھی یہی معنی روایت ہوئے ہیں۔''

اب آیۂ زیرِ بحث میں دیکھیے، جہاں تک پہلے معنی کا تعلق ہے، فقہا نے اگرچہ یہاں بالاتفاق وہی مراد لیے ہیں، لیکن آیت ہی میں دلیل موجود ہے کہ یہ معنی یہاں مراد لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

غور فرمائیے 'يوصيكم الله فى اولادكم' سے جو سلسلۂ بیان شروع ہوتا ہے، اس میں اولاد اور والدین کا حصہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے وصیت پر عمل درآمد کی تاکید 'من بعد وصية يوصى بها اودين' کے الفاظ میں کی ہے۔ زوجین کے حصوں میں اسی مقصد کے لیے 'من بعد وصية يوصى بها اودين' اور 'من بعد وصية توصون بها اودين' کے الفاظ آئے ہیں۔ تدبر کی نگاہ سے دیکھیے تو ان سب مقامات پر فعل مبنی للفاعل (معروف) استعمال ہوا ہے اور 'یوصی'، 'یوصین' اور 'توصون' میں ضمیر کا مرجع ہر جملے میں بالصراحت مذکور ہے۔ لیکن قرآن کا ایک طالبِ علم اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا کہ کلالہ کے احکام میں یہی لفظ مبنی للمفعول (مجہول) ہے۔ یہ تبدیلی صاف بتا رہی ہے کہ 'ان كان رجل يورث كلالة او امرأة' میں 'یوصی' کا فاعل یعنی موروث مذکور نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس آیت میں 'کلالة' کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسمِ صفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تغیر حجتِ قاطع ہے کہ قرآنِ مجید نے یہ لفظ یہاں پہلے معنی میں، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، استعمال نہیں

کیا ہے۔

اب رہے دوسرے اور تیسرے معنی تو ان میں سے جو بھی مراد لیے جائیں، آیت کا مدعا چونکہ ایک ہی رہتا ہے، اس لیے ترجیح محض حسنِ تالیف کے لحاظ سے ہو گی۔

چنانچہ آیت میں 'یورث' ہمارے نزدیک، بابِ افعال سے مبنی للمفعول ہے۔ 'کلالۃ' اس سے مفعول لہ ہے۔ 'کان' یہاں ناقصہ ہے اور 'یورث' اس کی خبر واقع ہوا ہے۔ 'رجل او امرأۃ' 'کان' کے لیے اسم ہیں۔ اس تالیف کی رو سے اس کا ترجمہ یہ ہو گا:

''اور اگر کسی مرد یا عورت کو اس کے کلالہ تعلق کی بنا پر وارث بنایا جاتا ہے۔''

وارث بنانے کا اختیار، ظاہر ہے کہ مرنے والے ہی کو ہو گا اور 'یورث' کا دوسرا مفعول چونکہ یہاں بیان نہیں ہوا، اس وجہ سے عربیت کی رو سے اس کے معنی اس سیاق میں یہی ہو سکتے ہیں کہ ان وارثوں کے علاوہ یا ان کے بعد یا ان کی عدم موجودگی میں ترکے کا وارث بنا دیا جاتا ہے جن کے حصے اوپر بیان ہوئے ہیں۔

'وله اخ او اخت فلكل واحد منهما السدس، فان كانوا اكثر من ذلك فهم شركاء في الثلث من بعد وصية يوصى بها او دين' یعنی ایک ہی رشتہ کے متعلقین میں سے اگر کسی ایک مرد یا عورت کو وارث بنایا جاتا ہے تو جس کو وارث بنایا جائے گا، اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو اس مال کا چھٹا حصہ جس کا اسے وارث بنایا گیا ہے، اس کے بھائی یا بہن کو دیا جائے گا اور اگر اس کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ باقی ۵/۶ یا دو تہائی اس مرد یا عورت کو دیا جائے گا جسے وارث بنایا گیا ہے۔ ہم اگر یہ کہیں کہ —— ''زید نے اس رقم کا وارث آپ کے بیٹے کو بنایا ہے، لیکن اس کا کوئی بھائی ہو تو ایک تہائی کا حق دار وہ ہو گا'' —— تو اس جملے کا مطلب ہر شخص یہی سمجھے گا کہ بھائی کا حصہ دینے کے بعد باقی روپیہ اس بیٹے کو دیا جائے گا جسے رقم کا وارث بنایا گیا ہے۔

قرآنِ مجید کی یہ ہدایت بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ مرنے والا کلالہ رشتہ داروں میں سے اپنے کسی بھائی، بہن، ماموں، پھوپھی یا چچا وغیرہ کو وارث بنا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس بھائی یا ماموں کو وارث بنایا جائے گا، مرنے والے کے بھائی اور ماموں اس کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ یہی معاملہ چچا، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کا ہے۔ کوئی شخص اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر کسی ایک ماموں یا پھوپھی کو ترجیح دے سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند

نہیں فرمایا کہ ایک ہی رشتہ کے دوسرے متعلقین بالکل محروم کر دیے جائیں۔ چنانچہ اس کے لیے یہ ہدایت فرمائی کہ کوئی شخص اگر، مثال کے طور پر، اپنے چچا زید کو باقی ترکے کا وارث بنا دیتا ہے اور اس کے چچا عثمان اور احمد بھی ہیں تو ترکے کے جس حصے کا وارث زید کو بنایا گیا ہے اس کا ایک تہائی عثمان اور احمد میں تقسیم کرنے کے بعد باقی ترکہ زید کو دیا جائے گا۔

'غیر مضار، وصیة من اللّٰه، واللّٰه علیم حلیم' آیت کے آخر میں یہ الفاظ اس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں۔ لیکن آیتِ کلالہ کی رو سے چونکہ مرنے والا اپنی مرضی سے کسی رشتہ دار کو وارث بنا سکتا ہے، اس لیے یہ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہما شما کا مشورہ نہیں ہے۔ پروردگارِ عالم کی وصیت ہے۔ اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر عمل سے باخبر ہے اور اگر بے جانے بوجھے اس سے کوتاہی ہو جاتی ہے تو اس کا خالق بردبار ہے، اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرتا ہے، وہ نرم خو ہے، بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس کے حکموں میں ان کے لیے سہولت ہے، تنگی اور مشقت نہیں ہے۔

۷۔ یَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِی الْكَلٰلَةِ ؕ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَیْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ یَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَیْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنْ كَانُوْۤا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ. (النساء۴:۱۷۶)

"لوگ تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہو: اللہ تمھیں کلالہ وارثوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے، اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہی ہو تو اس کے لیے ترکے کا نصف ہے اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہو گا اور بہنیں اگر دو ہوں تو اس کے ترکے میں سے دو تہائی پائیں گی۔ اگر کئی بھائی بہن، مرد عورتیں ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو گا۔ اللہ تمھارے لیے وضاحت کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو، اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔"

اس سے پہلے 'ان کان رجل یورث کلالة' کی جو تاویل اوپر بیان ہوئی ہے، اس کی رو سے چونکہ بہن بھائی،

چچاماموں، خالہ پھوپھی وغیرہ سب کلالہ ہیں اور مورث ان میں سے جس کو چاہے ترکے کا وارث بنا سکتا ہے، اس لیے ہو سکتا تھا کہ وہ کسی چچاماموں یا خالہ پھوپھی وغیرہ کو اپنے بھائی بہنوں پر ترجیح دے۔ مرنے والے کے اولاد ہو تو یہ صورت ہر لحاظ سے مناسب ہے، لیکن مورث بے اولاد ہو اور اس کے بھائی بہن ہوں تو یہ اختیار قابل اعتراض ٹھیرتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اولاد کے بعد باقی سب قرابت مندوں میں بھائی بہن ہی اقرب ہیں۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس صورت میں ترکے کا بڑا حصہ انھیں ملنا چاہیے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بہن بھائی ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ حصہ چونکہ وہی ہے جو انھیں اولاد کی موجودگی میں ملتا ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی کیا مرنے والے کو یہ اختیار ہے کہ وہ چاہے تو بھائی بہنوں کو وارث بنائے اور چاہے تو انھیں محروم کر دے۔ ہم نے آیات کی شرح کرتے ہوئے اوپر کہیں لکھا ہے کہ اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے وارث اس کے بھائی بہن ہیں، لیکن اسلوبِ بیان کی یہ دلالت ظاہر ہے کہ دلالتِ الفاظ کی طرح ہر احتمال سے خالی نہیں ہے کہ اس مسئلے پر بحث کی گنجایش باقی نہ رہے۔ اولاد موجود نہ ہو تو بھائی بہنوں کے بارے میں یہ سوال آج بھی پیدا ہو سکتا ہے اور عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی پیدا ہوا۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

يقول: دخل على رسول الله صلى الله عليه وسلم وانا مريض لا اعقل فتوضاء فصبوا على من وضوئه فعقلت فقلت يا رسول الله، انما يرثني كلالة فنزلت آية الميراث. (مسلم، کتاب الفرائض، باب ۲)

”وہ فرماتے ہیں: میں بیمار تھا اور مجھ پر بے ہوشی کا غلبہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے۔ آپ نے وضو کیا تو لوگوں نے آپ کے وضو کے پانی سے میرے اوپر چھینٹا دیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول میرے وارث صرف کلالہ ہیں تو اس پر آیتِ میراث[۵۰] نازل ہوئی۔“

اس حدیث کے الفاظ: 'انما يرثني كلالة فنزلت آية الميراث' سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ

۵۰۔ روایتوں میں وضاحت ہے کہ آیتِ میراث سے مراد یہاں سورۂ نساء کی یہی آخری آیت ہے جس میں بھائی بہنوں کے حصے بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی بعض روایتوں میں بہ صراحت بیان ہوئی ہے کہ ان کے وارثوں میں صرف بہنیں ہی تھیں۔

سوال کلالہ رشتہ داروں میں سے بالخصوص بھائی بہنوں کی میراث کے بارے میں تھا اور سورۂ نساء کی یہ آخری آیت اسی استفتا کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ اس میں سوالات نہایت اجمال کے ساتھ نقل ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوال کی نوعیت، اس کا موقع و محل اور اطراف و جوانب بالعموم اس جواب ہی سے واضح ہوتے ہیں جو اس کے بعد قرآن دیتا ہے۔ اس چیز کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو 'قل اللّٰہ یفتیکم فی الکلالۃ' کی تاویل میں بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں، دراں حالیکہ یہاں بھی سوال کو اگر جواب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو متکلم کا منشا بغیر کسی ابہام کے واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس میں اگر غور کیجیے تو وہی اسلوب ہے جو 'یوصیکم اللّٰہ فی اولادکم' میں ہے۔ وہاں وصیت میت کی وارث اولاد کے بارے میں ہے اور یہاں فتویٰ میت کے وارث کلالہ رشتہ داروں کے بارے میں ہے۔ لفظ 'کلالۃ' پر الف لام دلیل ہے کہ سوال کلالہ وارثوں میں سے کچھ مخصوص اقربا سے متعلق ہے اور جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقربا میت کے بھائی بہن ہیں۔ تمام کلالہ رشتہ داروں، مثلاً چچا ماموں، بھائی بہن، خالہ پھوپھی میں سے کسی کو وارث بنا دینے کی اجازت آیاتِ میراث میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ یہ چیز ملحوظ رہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا: کہہ دو، اللّٰہ تمھیں کلالہ رشتہ داروں میں سے بھائی بہنوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔ اس اسلوب کی نظیر سورۂ بقرہ کی آیت: 'یسئلونک عن الاھلۃ'[۵۱] میں موجود ہے۔

'ان امرؤ ھلک لیس لہ ولد'، یہ بھائی بہنوں کے میراث پانے کے لیے اسی طریقے پر شرط ہے، جس طرح 'فان لم یکن لہ ولد وورثہ ابواہ' میں ہے۔ وہاں معنی یہ ہیں کہ میت بے اولاد ہو اور ماں باپ ہی وارث ہوں تو ان کا حصہ یہ ہوگا اور یہاں مفہوم یہ ہے کہ مرنے والے کے اولاد نہ ہو اور اس کے بھائی بہن ہوں تو ان کا حصہ اس طرح ہے۔ اس شرط سے واضح ہے کہ بھائی بہن صرف اولاد کی غیر موجودگی میں وارث ہوتے ہیں۔ اولاد موجود ہو تو میت کے ترکہ میں ان کا کوئی حصہ مقرر نہیں ہے، الّا یہ کہ مرنے والا نساء کی آیت ۱۲ میں کلالہ کے حکمِ عام کے تحت ان میں سے کسی کو وارث بنا دے۔

بھائی بہنوں کے جو حصے یہاں بیان ہوئے ہیں، ان میں اور اولاد کے حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ 'ان کانوا اخوۃ رجالا ونساء فللذکر مثل حظ الانثیین' کا اسلوب دلیل ہے کہ یہ حصے بھی والدین

۵۱۔ ۲:۱۸۹۔ ملاحظہ ہو ”تدبرِ قرآن“، امین احسن اصلاحی، ج ۱، ص ۴۷۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اور احد الزوجین کا حصہ دینے کے بعد باقی ترکے میں سے دیے جائیں گے۔ اس کے دلائل ہم اولاد کے حصوں کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کر چکے ہیں۔ چنانچہ ترکے کا جو حصہ بھائی بہنوں میں تقسیم کیا جائے گا، میت کی صرف بہنیں ہی ہوں تو قرآن کی ہدایت کے مطابق، انھیں بھی اسی کا دو تہائی اور اسی کا نصف ادا ہو گا۔

یہ بات، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے، آیت ۱۱، ۱۲ سے بھی واضح تھی کہ اولاد کی عدم موجودگی میں بھائی بہن اس کے قائم مقام ہیں، لیکن نساء کی اس آیت تبیین نے اسے بالفاظِ صریح بیان کر دیا ہے۔ وہاں ممکن تھا کہ اسلوبِ بیان کی دلالت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ غلطی میں پڑ جاتے۔ اس وضاحت کے بعد یہ احتمال باقی نہیں رہا۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'یبین اللہ لکم ان تضلوا، واللہ بکل شیء علیم'۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معز امجد

التزامِ جماعت ـــــ اعتراضات کا جائزہ

(۳)

۴۔ ''الطاغوت'' کے معنی

مولانا گوہر رحمٰن صاحب نے چوتھی بات یہ فرمائی ہے کہ قرآن و سنت سے منحرف حکومت 'الطاغوت' ہے۔ اس وجہ سے ایسی حکومت کو ''الجماعۃ'' نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ قرآنِ مجید میں طاغوت کے التزام کا نہیں، بلکہ اس سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ، التزامِ جماعت سے مراد کسی ایسی حکومت کا التزام نہیں ہو سکتا جو قرآن و سنت سے منحرف ہو۔

مولانا محترم 'الطاغوت' کے معنی واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جو حکومت بھی اللہ و رسول کے احکام سے انحراف اور بغاوت اختیار کر لے، وہ طاغوت کی تعریف میں شامل ہو جاتی ہے۔'' (ماہنامہ ''فاران''، جون ۱۹۹۵، ص ۲۹)

مولانا محترم کی یہ بات بہت حد تک صحیح ہے۔ قرآنِ مجید میں لفظِ 'الطاغوت' اصلاً شیطان کے لیے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں قائم ہونے والی عدالتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنی عدالت قائم کرنے اور ایسی عدالتوں کو جانتے بوجھتے اپنا حکم بنانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ اور رسول کا فیصلہ ماننے سے انکار کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ قرآنِ مجید یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ماننے سے انکار کرنے کے معنی دراصل آپ کی نبوت اور آپ کے مامور من اللہ ہونے کا انکار کرنے کے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس انکار پر مبنی جو عدالتیں اور جو حکومتیں

بھی قائم ہوں گی، وہ شیطانی ہی ہوں گی۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اپنی عدالت قائم کر رکھی ہے۔ مسلمان حکمرانوں میں ایسے کون ہیں، جنھوں نے صریح الفاظ میں اللہ اور رسول کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا ہے؟ قرآنِ مجید میں 'الطاغوت' کسی ایک یا ایک سے زیادہ معاملے میں اللہ اور رسول کے فیصلوں سے انحراف کے لیے نہیں، بلکہ ان کے مقابل میں اپنا نظام، اپنے فیصلے اور اپنی عدالتیں کھڑی کرنے کے لیے آیا ہے۔ ایسے لوگوں کو اس کا مصداق قرار دینا، جو کسی کمزوری یا کوتاہی کے باعث کسی ایک یا ایک سے زیادہ معاملے میں اللہ اور رسول کے احکام سے منحرف ہو گئے ہیں، درست معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ تمام ایسی حکومتیں جو کسی بھی معاملے میں اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام سے منحرف ہیں، وہ 'الطاغوت' میں شامل ہیں، تب بھی سورۂ نساء میں منافقین پر جو تنقید ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ رسول کی عدالت کی موجودگی میں یہ لوگ شیطانی عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس اگر یہ اختیار ہو کہ وہ اپنے معاملات کا فیصلہ خدا کے قانون کے تحت کروالیں یا اس سے منحرف کسی شیطانی قانون کے تحت، تو ان سے جو رویہ مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ وہ رحمانی عدالتوں ہی کو ہر حال میں ترجیح دیں۔ ان آیات سے یہ بات کہاں سے نکلتی ہے کہ جہاں رحمانی عدالتیں موجود نہ ہوں، وہاں ان کو قائم کرنا اور شیطانی نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا مسلمانوں پر لازم ہے؟

اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی رو سے خدا اور رسول کا فیصلہ ماننے سے انکار کرنا صریح کفر ہے۔ چنانچہ جو حکمران یا جو حکومت خدا اور رسول کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دے، وہ اپنا حقِ اطاعت کھو دیتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، حکمران کی طرف سے کفرِ صریح یا کفرِ بواح کے بعد دین و شریعت کی رو سے مسلمان رعایا پر اس کی اطاعت لازم نہیں رہتی۔ اس صورتِ حال میں مسلمان رعایا اگر اپنے حکمرانوں کی اطاعت کرنے سے انکار کر دے تو امید ہے کہ عنداللہ ان سے اس بات کا ماخذہ نہیں ہو گا۔ مگر اس سے یہ نتیجہ کسی طرح بھی نہیں نکالا جا سکتا کہ کفرِ بواح کے بعد، حکمرانوں کی اطاعت سے انکار کرنا دین کا کوئی تقاضا، دینی لحاظ سے لازم یا مستحب ہی ہے۔ جو لوگ ایسی صورتِ حال میں حکومت کے خلاف کارروائی، اس کے ساتھ عدم تعاون اور اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کو ''فرض'' اور ''واجب'' ٹھہراتے ہیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اس

رائے کے حق میں قرآن و سنت کے واضح دلائل پیش کریں۔

مولانا محترم فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کی بعض آیات میں صراحت کے ساتھ اس بات سے روکا گیا ہے کہ نافرمان اور حدود سے تجاوز کرنے والے کی بات نہ مانی جائے۔ اس ضمن میں انھوں نے دہر: ۲۴، کہف: ۲۸ اور شعرا: ۱۵۱- ۱۵۲ کا حوالہ دیا ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ان آیات میں لفظِ ''اطاعت'' اسی معنی میں ہے، جو مولانا نے بیان فرمائے ہیں۔ اس کے باوجود، مولانا کی اس رائے کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شخص کے متعلق یہ فیصلہ کون کرے گا اور کس بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ ان آیات میں بیان ہونے والے کردار کا مصداق ہے۔ اگر ایک یا بعض لوگوں کی رائے یہ ہو کہ ہمارے موجودہ حکمران آثم و کفور یا مسرف اور مفسد ہیں، لیکن پوری قوم انھیں ایسا نہ سمجھتی ہو تو کیا ان بعض لوگوں کو مسلمانوں کے نظم میں خلل ڈالنے کی اجازت دے دی جاسکتی ہے؟ قرآنِ مجید کی مذکورہ آیتوں میں یہ الفاظ جن لوگوں کے لیے آئے ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین ہیں۔ ان آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی ہے کہ ان حقوق تلف کرنے والوں، ناشکروں، حدود سے تجاوز کرنے والوں اور زمین میں فساد پیدا کرنے والوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر آپ اپنا کام کرتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ رسولوں کے مخالفین کا آثم و کفور یا مسرف و مفسد ہونا تو ہر شک وشبہ سے بالا ہوتا ہے۔ مگر جونہی ہم مسلمانوں کے حکمرانوں کو اس حکم کا مصداق بناتے ہیں، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی رو سے ہم ایسا کرنے کا اختیار رکھتے بھی ہیں یا نہیں اور یہ اختیار اگر ہمیں حاصل ہے تو قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنے کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔

مزید برآں ہم مولانا محترم سے یہ بھی پوچھنا چاہیں گے کہ ماضی اور حال میں پاکستان کی کون سی حکومت نے اللہ اور رسول کے احکام سے انحراف اور بغاوت اختیار کی ہے؟ یہاں یہ واضح رہے کہ ''بغاوت کرنا'' اور ''انحراف اختیار کرنا'' کے معنی خدا اور رسول کے احکام ماننے سے انکار کرنے کے ہیں۔ ایسی ہی عدالتوں کو قرآنِ مجید میں 'الطاغوت' کہا گیا ہے۔ چنانچہ اگر مولانا کے لیے ممکن ہو تو ہم جیسے طالب علموں کو یہ بات سمجھانے کے لیے وہ اس ''بغاوت'' اور ''انحراف اختیار کرنے'' کی دو چار مثالیں بھی ضرور دے دیں۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ ہماری حکومتوں میں دین و شریعت کی تعلیمات سے بہت کچھ انحراف موجود ہے، مگر سوال یہ ہے کہ ان میں سے کس حکومت نے دین و شریعت کی تعلیمات کو ماننے سے صریح انکار کیا ہے؟

اس ضمن میں ہم مولانا محترم سے یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ قرآن و سنت کی وہ کون سی نصوص ہیں، جن کی

بنیاد پر ان کے نزدیک دین و شریعت سے منحرف حکمرانوں کے ساتھ وابستہ نہ رہنا دین کا تقاضا ہے۔ یہ بات تو ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے جو بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک حکمران کفرِ بواح یا صریح کفر اختیار نہ کر لے، اس وقت تک اس کی اطاعت کا لزوم دین و شریعت کا ایک واضح حکم ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ہمارے نزدیک اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے، وہ یہ ہے کہ حکمران اگر صریح کفر اختیار کر لے تو اس کی اطاعت لازم نہیں ہے۔ ان روایات کی بنیاد پر آخر یہ کس طرح کہا جا سکتا کہ کفرِ بواح کے بعد حکمران کی اطاعت سے انکار کرنا یا حکمرانوں کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کرنا دین کا کوئی تقاضا ہے۔ ہماری یہ بات اگر درست نہیں ہے تو مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی ان نصوص کی طرف ہماری رہنمائی فرمادیں جن کی رو سے وہ حکمرانوں کی طرف سے کفرِ بواح کے بعد، ان کی اطاعت سے انکار کر دینے یا انھیں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرنے کو لازم قرار دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ ایسی صورتِ حال میں دین اگر اس قسم کی کسی جدوجہد کو عام مسلمانوں پر لازم ٹھہراتا ہے تو اس نے یقیناً اس کا کوئی طریقہ بھی بتایا ہو گا، مولانا محترم سے ہماری گزارش ہے کہ وہ نصوصِ شریعت کی روشنی میں اس طریق کار کی وضاحت بھی فرمادیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس ضمن میں مولانا محترم نے قرآنِ مجید کی آیات: 'من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون'، '...هم الظالمون' اور '...هم الفاسقون' کا حوالہ دے کر یہ فرمایا ہے:

> ''ان آیات میں 'ومن لم یؤمن' کا لفظ نہیں آیا بلکہ 'ومن لم یحکم' کا لفظ آیا ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے بلکہ یوں فرمایا ہے کہ جو لوگ فیصلہ نہیں کرتے۔ تو معلوم ہوا کہ عقیدہ جو بھی ہو مگر جب عملاً قرآن و سنت پر فیصلے نہیں کرتے اور حکومت کے نظام میں قرآن و سنت کا التزام نہیں کرتے تو وہ کافر، ظالم اور فاسق ہیں...'' (ماہنامہ ''فاران''، جون ۱۹۹۵، ص ۲۹)

قرآنِ مجید کی ان آیات پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ ان میں حرفِ 'لم' استعمال ہوا ہے۔ یہ بات عربی جاننے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حرفِ 'لم' نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ گویا آیت سے مراد یہ ہو گی کہ جو شخص اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرنے سے انکار کر دے، پوری آزادی، پورا اختیار اور پورا فہم رکھنے کے باوجود انکار کر دے۔ اصل کافر، ظالم اور فاسق وہی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی، غور کیجیے تو شریعت سے انحراف کے کسی ایک یا ایک سے زیادہ واقعے پر کافر، ظالم اور فاسق نہیں کہا گیا، بلکہ شریعت کو ماننے

اور اس کے لحاظ سے فیصلہ کرنے سے انکار کرنے پر کہا گیا ہے۔ دوسری بات ان آیات پر تدبر کرنے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں حقیقی کفر، ظلم اور فسق کا ذکر ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر، آیات میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آخرت کے روز ایسے ہی لوگ کافر، ظالم اور فاسق ٹھہریں گے۔ چنانچہ یہی بات واضح کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"گویا جو لوگ جانتے بوجھتے اور آزادی اور اختیار رکھتے ہوئے اللہ کے احکام و قوانین کے خلاف فیصلے کرتے اور کراتے ہیں وہ کافر، ظالم اور فاسق ٹھہریں گے۔" (تدبرِ قرآن، ج ۲، ص ۵۳۲)

مگر اس سب کچھ کے باوجود مولانا گوہر رحمٰن صاحب کی یہ بات اگر مان بھی لی جائے کہ اس شریعت کے خلاف فیصلہ کرنے والے قرآن کی رو سے ظالم، فاسق اور کافر ہیں، تب بھی سوال یہ ہے کہ قرآنِ مجید یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ایسے ظالم، فاسق اور کافر حکمرانوں کی اطاعت سے انکار کرنے اور ان کی تبدیلی کی جدوجہد کرنے کو کہاں لازم ٹھہرایا ہے؟ مولانا نے اپنے مضمون میں اس حوالے سے جو آیات نقل فرمائی ہیں، ہمارے نزدیک، ان کا کوئی تعلق نظمِ اجتماعی اور مسلمانوں کے منتخب حکمران کی اطاعت سے نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کی بنیاد پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں قرآن مجید نے ایسے "ظالم، فاسق اور کافر" حکمرانوں کی اطاعت سے انکار کرنے کا حکم دیا ہے۔

بعض روایات میں البتہ یہ بات ضرور نقل ہوئی ہے کہ حکمران اگر کسی ایسی بات کا حکم دے، جس سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہو تو اس معاملے میں خدا کی فرماں برداری پر قائم رہا جائے اور حکمران کی بات ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس روایت سے مراد بھی یہ نہیں ہے کہ ایسے کسی واقعے کے بعد، حکمران کی اطاعت سے انکار کر دیا جائے۔ روایت میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی خدا کی معصیت کا حکم نہ مانے، یہ نہیں ہے کہ اسے اگر خدا کی معصیت کا حکم دیا جائے تو اس کے بعد وہ ہر معاملے میں حکمران کی اطاعت سے انکار کر دے۔ چنانچہ تاریخ کے اوراق میں امتِ مسلمہ کے علما و صلحا کا یہی طرزِ عمل ہمارے سامنے رہا ہے۔ انھوں نے حکمران کے جس حکم کے بارے میں یہ سمجھا کہ اس کو ماننے سے خدا کی نافرمانی لازم آتی ہے، اس کی اطاعت سے پوری شان سے خود بھی انکار کر دیا اور دوسروں کو بھی اسی بات کی تعلیم دی مگر اسی حکمران کے باقی تمام احکام کے آگے انھوں نے خود سر جھکائے رکھا اور اپنے شاگردوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تعلیم دی۔

اس ضمن میں مولانا نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے لکھا ہے:

”سیکولر جمہوریت کا اصول تو یہ ہے کہ جب تک عوام کا اعتماد کسی حکومت کو حاصل ہو، اس وقت تک اس کو حکومت کرنے کا حق حاصل رہتا ہے لیکن اسلام کے شورائی نظام کا اصول تو یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی معتمد حکومت اگر اللہ اور رسول سے احکام سے باغی ہو جائے پھر بھی وہ اسلامی حکومت ہو گی اور اس کے ساتھ چمٹے رہنا دین وایمان کا تقاضا ہو گا۔“ (ماہنامہ ”فاران“، جون ۱۹۹۵، ص ۲۹)

مولانا محترم کی اس بات کا جواب ہمارے اس مضمون میں پہلے ہی گزر چکا ہے۔ ہم نے ”الجماعۃ“ کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا تھا کہ اجتماعی معاملات سے متعلق قرآنِ مجید کے اصول 'امرهم شورٰی بينهم' کے پیشِ نظر، التزامِ جماعت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اجتماعی معاملات میں جہاں اختلاف ہو جائے، وہاں اکثریت کی رائے کی عملاً پابندی کی جائے۔ چنانچہ یہی بات واضح کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

يد الله على الجماعة. فاذا شذ الشاذ منهم اختطفته الشياطين. فاذا رايتم اختلافا فاتبعوا السواد الاعظم. فانه من شذ شذ فى النار.

(المستدرک، کتاب العلم)

”الجماعۃ پر اللہ کی رحمت کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ جب کوئی اس سے الگ ہوتا ہے تو اسے شیاطین اچک لے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے جب تم لوگ کوئی بڑا اختلاف دیکھو تو (عملی طور پر) اکثریتی گروہ کی پیروی کرو۔ کیونکہ جو الجماعۃ سے الگ ہوا اسے الگ کر کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔“

اپنے مضمون کے پہلے حصے میں اس روایت کے تحت ہم نے لکھا ہے:

”اکثریتی گروہ کی رائے کی عملاً پابندی کرنے کا یہ حکم، قرآنِ مجید کے حکم 'امرهم شورٰی بينهم' پر مبنی ہے۔ قرآنِ مجید کے اس حکم سے اجتماعی معاملات کے بارے میں جو رہنمائی ملتی ہے، اس کی وضاحت میں مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ”تفہیم القرآن“ میں پانچ باتوں کو اس کا لازمی تقاضا قرار دیا ہے۔ ایک یہ کہ اجتماعی معاملات میں افراد کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہو، انھیں یہ بات معلوم ہو کہ ان کے معاملات کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ انھیں یہ حق بھی حاصل ہو کہ وہ اگر اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی دیکھیں، تو اس پر ٹوک سکیں اور اگر اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو اپنے سربراہوں کو بدل سکیں۔ دوسرے یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اسے لوگوں کی آزادانہ

رضامندی سے مقرر کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ شوریٰ کے لیے ایسے لوگ مقرر کیے جائیں، جن کو لوگوں کا حقیقی اعتماد حاصل ہو اور جنھیں فی الواقع، لوگوں کا نمائندہ کہا جا سکے۔ چوتھے یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان اور ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ اور پانچویں یہ کہ اہلِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے کو اجماعیت کے فیصلے کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ کسی ایک شخص یا گروہ کو ہرگز یہ اختیار نہ دیا جائے کہ وہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کر سکے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اکثریتی رائے کی عملاً پابندی کا یہ حکم اصلاً فصلِ نزاعات کا ایک طریقہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ قرآنِ مجید کی نظر میں اکثریتی رائے ہمیشہ حق پر ہوتی ہے۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا رایتم اختلافا فعلیکم بالسواد الاعظم.(ابن ماجہ، کتاب الفتن) "جب تم اختلاف دیکھو تو اکثریت کی پیروی کرو۔"

اس روایت کے تحت ہم نے لکھا ہے:

"ظاہر ہے کہ اختلافات کو رفع کرنے کا عملاً، اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا بھی ہزاروں سال کے تجربات کے بعد اب اسی نتیجے پر پہنچی ہے کہ ایسے تمام اجتماعی معاملات میں، جہاں اتفاقِ رائے نہ پایا جاتا ہو، وہاں اکثریت ہی کی رائے کو نافذ العمل ہونا چاہیے۔ یہی بات قرآنِ مجید نے اپنے لافانی اسلوب میں 'امرھم شوریٰ بینھم' کا اصول دے کر واضح کر دی تھی۔ اور اسی بات کو ان روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی واضح فرما دیا ہے۔

چنانچہ معاملہ خواہ دین کی تعبیر کا ہو یا سیاست، معیشت، معاشرت اور حدود و تعزیرات کا، جس معاملے میں بھی اختلاف ہو گا، اس میں ریاستی سطح پر اکثریت کی رائے کو نافذ کیا جائے گا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو اس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اس رائے کو اسلام کے اصولوں کے منافی بھی سمجھتا ہو، ایک اسلامی ریاست میں اسے اپنے اس اختلاف کے اظہار اور لوگوں کو اپنی بات کا قائل کرنے کا حق بھی حاصل ہو گا، مگر جب تک اکثریت کی رائے اس کے حق میں نہیں ہو جاتی، اس وقت تک اسے عملاً اسی رائے کی پابندی کرنی ہو گی، جسے مسلمانوں کی اکثریت نافذ العمل قرار دے گی۔

قرآنِ مجید کی مذکورہ آیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات سے واضح ہے کہ یہ معاملہ بنیادی اہمیت کا

حامل ہے۔اس سے گریز اجتماعیت سے متعلق اسلامی اصولوں سے گریز کے مترادف ہے۔مزید برآں، جب ایک اسلامی ریاست میں یہ اصول مان لیا جائے اور اس کے بعد کوئی شخص اجتماعی رائے سے صرفِ نظر کر کے اپنی من مانی کرنے کی کوشش کرے تو یہ نظمِ اجتماعی سے بغاوت کے مترادف ہے۔‘‘

چنانچہ اسی اصول پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کہا:

من بایع رجلا عن غیر مشورة من المسلمین فلا یبایع ھو ولا الذی بایعه تغرة ان یقتلا.(بخاری، کتاب الحدود)

’’جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی کی بیعت کرے تو ان دونوں کی بیعت نہ کی جائے، کیونکہ یہ دونوں اپنے اس عمل کے نتیجے میں قتل کیے جا سکتے ہیں۔‘‘

(جاری)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متفرق خطوط

محترم مدیرِ ''اشراق''

السلام علیکم،

''اشراق''فروری ۱۹۹۹ میں ڈاکٹر آغا طارق سجاد صاحب کا ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے حکیم محمد سعید مرحوم و مغفور اور جناب صلاح الدین مرحوم کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

حکیم محمد سعید کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے طبی خدمات کے علاوہ کوئی دینی یا علمی خدمت انجام نہیں دی۔ حکیم محمد سعید کے قتل پر اخبارات و رسائل میں جو مضامین و خیالات شائع ہوئے ہیں اگر ڈاکٹر صاحب نے ان کا مطالعہ کیا ہوتا تو میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کبھی یہ اعتراض نہ کرتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹر طارق صاحب کے نزدیک علمی و دینی خدمات کا کیا معیار ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب نے ایک طرف خود چار پانچ کتابیں سیرتِ نبوی اور دینی موضوعات پر لکھی ہیں جو ادارہ ''ہمدرد'' نے شائع کیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کے مختلف شہروں میں سیرت کانفرنسوں کا انعقاد کیا۔ مدینۃ الحکمت قائم کی۔ انٹر نیشنل قرآن کانفرنس کا انعقاد کیا۔ ابن الہیثم کانفرنس، البیرونی کانفرنس وغیرہ منعقد کیں۔ کیا یہ علمی خدمات نہیں ہیں۔ ڈاکٹر آغا طارق حکیم محمد سعید کی دینی و علمی خدمات کا اگر اعتراف نہ کریں تو حکیم صاحب کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جس طرح سورج چاند اور ستارے روشن ہیں اسی طرح حکیم محمد سعید صاحب کی خدمات روشن ہیں۔

جناب محمد صلاح الدین مرحوم کے بارے میں ڈاکٹر طارق صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس پر

میں کسی قسم کا تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

والسلام

عبدالرشید عراقی

گوجرانوالہ

جناب مدیرِ ''اشراق''

السلام علیکم،

آپ نے ڈاکٹر آغا طارق صاحب کا خط چھاپا ہے۔ مجھے یہ خط پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی ہے۔

آغا طارق صاحب نے حکیم سعید صاحب کی وفات پر لکھے گئے مضمون کو آڑ بنایا ہے اور اصلاً مدیرِ ''تکبیر'' کے حوالے سے اپنے جذبات ظاہر کیے ہیں۔ مدیرِ ''تکبیر'' چار سال پہلے فوت ہوئے تھے لیکن ان کو چار سال بعد یہ خیال آیا کہ ''اشراق'' میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا وہ درست نہیں تھا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے آخر میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ مدیرِ ''تکبیر'' کے بارے میں ان کی رائے جو بھی ہو انھیں چاہیے تھا کہ وہ ''اشراق'' کے اخلاقی معیار کو پیشِ نظر رکھتے۔

خیر اندیش

ڈاکٹر ظفر اعجاز

ڈیرہ غازی خان

محترم مدیرِ ''اشراق''

السلام علیکم،

''اشراق'' فروری ۱۹۹۹ میں شائع شدہ ڈاکٹر آغا طارق صاحب کے خط کے حوالے سے عرض ہے کہ ''اشراق'' تحقیقی اور علمی کاوشوں پر مبنی ایک ایسا جریدہ ہے جو دینِ اسلام کے شعوری فکر کا احاطہ کرنے اور اس کی اشاعت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ یہی اس کی شناخت اور وجۂ توقیر بھی ہے۔ چنانچہ اس میں جو تحریریں بھی شامل کی جائیں ان کا تعلق لازماً اس بنیادی فریضہ سے ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس زیرِ نظر تحریر ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہے جو اگرچہ صحیح بھی ہو تب بھی اس کا تعلق کسی طرح بھی اس جریدے کے بنیادی مشن سے نہیں ہے۔

لہٰذا (اس کے مندرجات کی صحت یا عدم صحت پر خیال آرائی کیے بغیر) زیادہ سود مند یہ ہو گا کہ اس طرح کی بحثوں کو نہ تو خود چھیڑا جائے اور نہ ہی ان کو آگے بڑھانے کے لیے صلائے عام دی جائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی شخصیات جو عوامی اور سیاسی پس منظر کی حامل ہوتی ہیں ان کو پسند کرنے اور ناپسند کرنے والوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اور ہر ایک کے پاس اس پسند و ناپسند کا اپنا اپنا جواز موجود ہوتا ہے جس کو بدلنے کی کوشش کرنے کا بالعموم کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لیے ایسے جریدے میں صفحات مختص کرنے چاہییں کیونکہ اس طرح کوئی بھی اہتمام ایک کبھی نہ ختم ہونے والی اور لاحاصل بحث کو جنم دے سکتا ہے جس میں الجھ کر خواہ نادانستہ ہی سہی آپ اپنے مشن کی اصل کو متاثر کر بیٹھیں گے۔ الاّ یہ کہ آپ کسی ایسی شخصیت کو زیرِ بحث لائیں جس کا زیرِ بحث لانا آپ کے کاز کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو۔

کیا آپ اس کی تائید کریں گے کہ فزکس یا کیمسٹری کی تحقیقات پر مبنی کسی جریدہ میں حکیم محمد سعید یا محمد صلاح الدین کی طرح کی اختلافی شخصیات کے تجزیے پیش کیے جائیں اور ان کو موضوعِ بحث بنایا جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے جرائد میں جو کسی بھی نوع کے تحقیقی کام کا بار اٹھائے ہوئے ہیں اس طرح کے تذکرے غیر متعلق ہی کہلائیں گے اور بے مقصد اور لاحاصل مباحث کو جنم دیں گے۔ البتہ اس طرح کی مشق کے لیے سیاسی یا نیم سیاسی اخبارات و رسائل وافر تعداد میں دستیاب ہیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے انھیں استعمال کرنا بدرجہا بہتر ہو گا۔

خیر اندیش

مشتاق احمد

لاہور

محترم معز بھائی

السلام علیکم

'الجماعۃ' کے بارے میں آپ کا تحقیقی مضمون مجھے ذاتی طور پر بہت پسند آیا۔ یہ مضمون اس قابل ہے کہ

علیحدہ سے شائع ہو۔ دسمبر کے ''اشراق'' میں بلاشبہ، رمضان کے حوالے سے بہت عمدہ مضامین شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محنتوں کو قبول فرمائے اور ہم سب کے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین!

اپنے پچھلے خط میں ''اشراق'' کے حوالے سے ایک بات تو میں نے یہ عرض کی تھی کہ یہ علمی پرچہ بن چکا ہے۔ الحمد للہ اس اعتبار سے بتدریج ''اشراق'' میں بڑی 'Improvement' ہوئی ہے اور علمی پہلو کم ہوئے بغیر دعوتی اسلوب جو نہ صرف موثر ہے بلکہ عام قارئین کی ذہنی سطح سے ہم آہنگ ہے، بڑھتا جارہا ہے۔ تاہم اُس خط میں میں نے یہ چیز بھی 'Point out' کی تھی کہ پاکستان میں دعوت کے کام کے لیے کھڑے ہونے والے کسی شخص، گروہ یا ادارے کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کو مایوسی کے اس بھنور سے نکالے جس میں پھنسنے والی کوئی قوم اعلیٰ انسانی خصلتوں کے اعتبار سے مردہ ہو جاتی ہے۔ ایسی کسی قوم میں میرے ناقص مطالعے اور فہم کی روشنی میں بڑے سے بڑا فرد اور بڑی سی بڑی دعوت پیدا ہو جائے، تب بھی وہ صفحۂ تاریخ پر کوئی روشن کارنامہ رقم کرنے کے قابل نہیں ہو پاتی۔ میری قوم میں ابھی تک بڑا صبر ہے۔ لیکن اگر یہی مایوسی پھیلانے والے خود غرض قائدین اور نام نہاد دانش ور اور دین کی سمجھ سے عاری مصلحین قوم کے اعصاب پر سوار رہے تو پھر آپ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ کسی درخت کی کھوہ میں پناہ ڈھونڈیں۔

میں نے اس ضمن میں مولانا وحید الدین خان کے ماہنامہ ''الرسالہ'' کا حوالہ دیا تھا مگر جواب میں آپ نے فرمایا کہ آپ ''الرسالہ'' کے انداز میں اپنا پرچہ نہیں نکال سکتے۔ میری مراد ''الرسالہ'' سے اس کی دعوت تھی جو امید کا سبق دیتی تھی۔ میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ کئی سال تک میں ہفت روزہ ''تکبیر'' کا قاری رہا ہوں مگر ''تکبیر'' پڑھ کر ہمیشہ ذہنی جھنجلاہٹ اور انتشار ہی میں مبتلا ہوا۔ سازشوں کے تذکرے، مسائل کے انبوہ، اغیار کی دشمنی اور اپنوں کی بے حسی، ان سب کو پڑھ پڑھ کر میں اس کے بعد کیا کر سکتا تھا کہ دوسرے لوگوں سے ان کا تذکرہ کر کے اپنی بھڑاس نکالوں، قوم و ملت کے مستقبل سے مایوس ہو کر ایک خود غرض انسان بن جاؤں جسے اپنے کیریئر، جاب اور مستقبل کے سوا کسی چیز کی فکر نہ ہو۔ میں ایک ایسا منافق بن جاؤں جو ہر محفل میں امت کی بربادی کے تو مرثیے پڑھے مگر عین اس وقت اپنے مسقبل کی شان دار عمارت کی تعمیر پر پوری توانائی خرچ کر رہا ہو۔ معزز بھائی میں عرض کرتا ہوں اور سچ عرض کرتا ہوں اس سوچ کے حاملین یہی کام کرتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم لوگ اپنی قوم کو یاس و حرمان کی موجودہ کیفیت سے نکالنے کی کوشش کریں۔ مایوسی وہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مرض ہے جو انسان اور پوری سوسائٹی میں بدترین اخلاقیات پیدا کر دیتا ہے۔ مایوسی انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ یہ انسان سے قربانی وایثار کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ یہ فرد کو معاشرے کے لیے ضرر رساں بناتی ہے۔ انسانوں سے عملیت چھین لیتی ہے۔ باہمی بغض وعناد پیدا کرتی ہے۔ غرض وہ ساری خامیاں جو قوموں کو تباہ کر دیتی ہیں مایوسی کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری ان گزارشات پر توجہ فرمائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پوری قوت و طاقت، علمی زور واستدلال اور نصیحت و خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ کام کیا جائے تو اصلاح کا بہت کچھ امکان ابھی باقی ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم قوم میں ان بلند مقاصد کا شعور پیدا کریں جس کا تعین قرآن نے ہمارے لیے کیا ہے۔

اس ضمن میں مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

> ''یاد رکھیے، ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم ایک بامقصد قوم تیار کریں، ہمیں قوم کے افراد کو وہ تعلیم دینی ہے جس سے وہ ماضی و حال کو پہچانیں۔ ان کے اندر وہ شعور بیدار کرنا ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہو نا جانیں۔ ان کے اندر وہ حوصلہ ابھارنا ہے کہ وہ شخصی مفاد اور وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر قربانی دے سکیں۔ یہ سارے کام جب قابل لحاظ حد تک ہو چکے ہوں گے اس کے بعد ہی کوئی ایسا اقدام کیا جا سکتا ہے جو فی الواقع ہمارے لیے کوئی نئی تاریخ پیدا کرنے والا ہو۔ اس سے پہلے اقدام کرنا صرف موت کی خندق میں چھلانگ لگانا ہے نہ کہ زندگی کے چمنستان میں داخل ہونا۔'' (رازِ حیات ص ۱۹)

اس ضمن میں، میں اپنا تجربہ بھی عرض کر دوں۔ مختلف اسباب کی بنا پر میرے دل میں شرعی قوانین کی کوئی خاص قدر نہ تھی۔ مگر اس رمضان میں نظمِ قرآن کو مد نظر رکھ کر جب قرآن کا مطالعہ شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ خدا شریعت کو کتنی زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ مگر اسی مطالعہ میں مجھ پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ شریعت کی یہ شاندار عمارت تقویٰ کی بنیادوں ہی پر قائم ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر شریعت کی بات کرنا قرآن سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ خدا کا خوف اور خدا سے مایوسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے اور یقیناً خدا نے کسی بشر کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔

آخر میں آپ کی خدمت میں ملاحظے کے طور پر دو دعائیں پیش کر رہا ہوں۔ پہلی دعا ایک اعرابی کی ہے جو اس نے دورانِ طواف میں پڑھی تھی:

اللهم قد اطعنا فی احب الاشياء اليک شهادة ان لا اله الا انت وحدک لا

شریک لک ولم نعص فی البعض الاشیاء الیک الشرک بک. فاغفر اللھم ما بین ذلک.

''اے اللہ ہم نے تیری سب سے پسندیدہ چیز، یعنی تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، میں تیری فرماں برداری کی اور تیری سب سے ناپسندیدہ چیز، یعنی شرک، میں تیری نافرمانی نہیں کی۔ اے اللہ، ان کے درمیان جو کچھ ہوا اسے معاف کر دے۔''

دوسری دعا اموی خلیفہ غالباً ہشام بن عبد الملک کی ہے جو اس نے دوران خطبہ میں مانگی تھی اور بے اختیار رونے لگا تھا۔ اس وقت اس کا متن مجھے یاد نہیں۔ البتہ ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

''میرے مالک میرے گناہ بہت بڑے ہیں لیکن تیری رحمت میرے گناہوں سے بڑھ کر ہے۔ تو بس اپنی بہت بڑی رحمت کے چھوٹے سے حصے سے میرے بڑے بڑے گناہوں کو معاف کر دے۔''

فروری کے ''اشراق'' میں ڈاکٹر آغا طارق کی صلاح الدین صاحب اور حکیم سعید پر تنقید پڑھی۔ تفصیلی تبصرہ کا تو موقع نہیں مگر میری وہ قوم جو اپنی ذات سے بلند لوگ پیدا کرنے کے معاملے میں دن بدن بنجر ہوتی جا رہی ہے اس کے بڑے لوگوں پر ایسی یک طرفہ تنقید اس کی اعتباریت اور خود اعتمادی بالکل ختم کر دے گی۔ اختلاف ہر شخص سے ہو سکتا ہے۔ مگر اسے شیطان قرار دینا مناسب نہیں۔ انسان فرشتہ اور شیطان کے درمیان کی مخلوق ہے، اسے وہیں رہنے دیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دعاؤں کا طالب

ریحان احمد

سعودی عرب

طالب محسن

''اشراق'' کے نام خطوط میں پوچھے گئے قارئین
کے سوالات پر مبنی مختصر جوابات کا سلسلہ

انفاق کا ایک مسئلہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: ایک صاحبِ علم کہتے ہیں کہ ہمارے پاس اپنی ضرورتوں سے جو زائد مال ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر میں اپنی حال اور مستقبل کی ضرورتوں کا لحاظ کروں تو شاید کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر سکوں۔ میری تین بیٹیاں ہیں۔ رہنے کے لیے گھر نہیں ہے۔ اگر میں گھر بنانے اور بیٹیوں کی شادی کے لیے پس انداز کرنا شروع کروں تو اللہ کی راہ میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ کر سکوں۔

میرا دل یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند ہے تو جو کچھ ہاتھ میں ہے وہ اسے دے دوں۔ میرا اللہ مالک ہے۔ میں اس کے بندوں کی مدد اس کی رضا کے لیے کروں گا تو وہ میری مدد ضرور کرے گا۔ لیکن وہ صاحبِ علم کہتے ہیں کہ یہ انتہا پسندی ہے اور یہ اسلامی رویہ نہیں ہے۔

اب چونکہ ایک مثال میرے سامنے ہے تو آپ کی رائے جاننا آسان ہو گا۔ اخبار میں ایک خاتون کی حسبِ ذیل اپیل ''دکھی ماں کی اپیل'' کے عنوان سے چھپی ہے:

''میری اٹھارہ سالہ نوجوان بیٹی تین سال خون کے کینسر میں مبتلا رہی۔ اسے مرض الموت سے بچانے کے لیے ہم نے سرتوڑ کوشش کی۔ اخبارات اور کالم نگاروں نے اس کوشش میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ سابق وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو نے اس کے علاج کے لیے بیرونِ ملک بھجوانے کی منظوری بھی دی۔ مگر نوکر شاہی نے روڑے اٹکائے اور وزیرِ اعظم کی منظوری کے باوجود ڈیڑھ سال کے طویل انتظار کے بعد

ہماری بیٹی بغیر علاج موت کے منہ میں چلی گئی۔ یوں ہماری بیٹی تو مر کر تمام دکھوں سے بے نیاز ہو گئی۔ مگر ہم لوگ زندہ درگور ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اپنی بیٹی کی تین سالہ بیماری کے دوران میں ہمارا گھر بار بک گیا۔ ہمارے دیگر بچوں کی تعلیم ختم ہو گئی اور ہم لوگ تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کے مقروض ہو گئے۔ اب ایک طرف نوجوان بیٹی کی موت کا غم ہے اور دوسری طرف قرض خواہوں نے اس قدر پریشان کر رکھا ہے کہ جینا دوبھر ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مصیبت اکیلے نہیں آتی۔ اب کچھ عرصہ سے میرا خاوند گردے کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہے اور کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ یوں ہماری مالی حالت مزید خراب ہو گئی ہے اور کئی دفعہ تو نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اپنے سابقہ تلخ تجربات کی بنا پر مجھے حکومتی اداروں سے کوئی امید تو نہیں مگر مجبوراً ایک بار پھر اپیل کرتی ہوں کہ میری مدد کی جائے۔ امید ہے کہ اہلِ ثروت بھی ہماری مدد کریں گے۔"

(آفتاب بیگم معرفت شیخ طاہر محمود مکان نمبر ایف ۵۴۳، مسلم کالونی، آریہ محلہ، راولپنڈی)

میں نے برسوں کی نوکری میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ بچایا ہے۔ اتنی ہی رقم کی اس خاتون کو ضرورت ہے۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اپنی ساری بچت ان کو دے دوں تاکہ ان کا مسئلہ حل ہو جائے۔ پھر اس صاحبِ علم کی باتیں یاد آئیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجھے بتائیں کہ صحیح اسلامی رویہ کیا ہے تاکہ آیندہ بھی ایسے معاملات میں وہ میرے لیے رہنما اصول کے طور پر رہے۔

جواب: اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دینا نہایت پسندیدہ صفت ہے۔ اسے انتہا پسندی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ قرآنِ مجید نے انصار کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: 'ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ'[1]۔ تاہم اس کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے اور یہ حوصلہ ہر شخص میں نہیں ہوتا۔ آدمی اس طرح کا کوئی اقدام اپنے پروردگار پر بڑے اعتماد اور توکل ہی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ یہ چیز میسر نہ ہو تو اس راستے پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ (جاوید احمد غامدی)

اسوۂ نبی اور تمدن

سوال: آپ نے ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ خدا کی سچی محبت پیدا کرنے کا ایک نسخہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اختیار کریں پھر آپ

۱۔ الحشر ۵۹: ۹۔ "اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو۔"

نے یہ کہا کہ مگر یہاں یہ بات پیشِ نظر رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ، حضور کے تمدن یا آپ کی شخصی زندگی میں نہیں ہے۔

مجھے اس فقرے کی تفہیم میں دشواری ہو رہی ہے۔ کیا واقعی آپ اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقسیم کے قائل ہیں؟

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین و اخلاق سے متعلق تمام معاملات میں ہمارے لیے واجب الاطاعت ہادی اور اسوۂ حسنہ ہیں۔ اس دائرے سے باہر کی چیزیں مثلاً یہ کہ آپ ایک خاص طرح کا کرتا پہنتے اور تہ بند باندھتے تھے، سر پر عمامہ رکھتے تھے، آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے، خچر پر سواری کرتے تھے، ایک خاص طرزِ تعمیر کے مطابق بنے ہوئے گھر میں رہتے تھے، کھانے پینے میں بعض چیزوں کو طبعاً پسند اور بعض کو ناپسند فرماتے تھے، جنگ میں تیر، تلوار اور گھوڑے اور اونٹ استعمال کرتے تھے، وغیرہ ہرگز اسوہ نہیں ہیں اور نہ دین و شریعت کی رو سے ان کا اتباع کوئی مطلوب چیز ہے۔ میرے جن جملوں کو سمجھنے میں آپ کو دقت ہوئی ان سے میرا مدعا یہی تھا۔ اس کے بعد بھی کوئی اشکال باقی رہے تو مجھے وضاحت سے خوشی ہوگی۔ (جاوید احمد غامدی)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بنی اسماعیل

سوال: آپ حضرات مشہور حدیث 'امرت ان اقاتل الناس' (مجھے لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔) میں 'الناس' کو بنی اسماعیل کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں۔ اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب: یہ قاعدہ ہر زبان میں موجود ہے کہ لفظ اپنے اطلاق میں عام ہے لیکن متکلم کا منشا عام نہیں ہوتا۔ مثلاً دیکھیے، آپ کہتے ہیں کہ استاد نے طلبہ کو مضمون لکھنے کے لیے کہا۔ اس میں طلبہ کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن اس سے ایک متعین اسکول کی متعین کس کے طلبہ مراد ہیں۔ اس تعیین کے قرائن بعض اوقات تحریر کے سیاق و سباق میں اور بعض اوقات خارج میں موجود ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ اس حدیث کے زیرِ بحث جملے کا بھی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ یہی فرمایا ہے کہ مجھے 'لوگوں' کے ساتھ لڑنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس سے سارے لوگ مراد نہیں ہیں۔ اس تخصیص کی دلیل خود قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ سورۂ توبہ میں بنی اسماعیل کے معاملے میں تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ لیکن یہود و نصاریٰ کے معاملے میں اس کے برعکس جزیہ لے کر ماتحت شہریوں کی حیثیت سے رکھنے کا حکم دیا گیا اور انھیں قتل کر دینے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس سے یہ بات یقینی طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ حدیث میں ''لوگ'' کا لفظ عام نہیں خاص ہے۔ (طالب محسن)

فکرِ پرویز

سوال: غلام احمد پرویز کی فکر کیا ہے، کیا وہ مسلمان ہیں؟

جواب: غلام احمد صاحب پرویز اس دور کی باقیات میں سے ہیں جب جدید سائنس اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افکار نے مذہب کو چیلنج کیا تھا اور اس کے نتیجے میں بعض لوگ دین کو قابل قبول بنانے کے لیے دین کی صورت تبدیل کرنے پر راضی ہو گئے۔

پرویز صاحب کے بارے میں یہ بات غلط ہے کہ وہ حدیث کے منکر ہیں۔ حقیقت میں وہ ہر اس بات کے منکر ہیں جو جدید فکری ذہن کو قبول نہیں ہے خواہ وہ قرآنِ مجید ہی میں کیوں نہ بیان ہوئی ہو۔

جہاں تک ان کے مسلمان ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ہم یہی کہتے ہیں کہ کسی عام آدمی یا عالم کا کسی کو غیر مسلم قرار دینا ایک خلافِ دین امر ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم دوسرے کو اس کی غلطی بتا دیں۔

(طالب محسن)

'مشرق' اور 'مغرب' کے معنی

سوال: قرآن مجید میں مشرق اور مغرب کے الفاظ کیوں آئے ہیں۔ سائنس دانوں کے نزدیک نہ سورج طلوع ہوتا ہے نہ غروب؟

جواب: قرآنِ مجید میں مغرب اور مشرق کے الفاظ اپنے معروف معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ سائنسی حقیقت نہ قرآن میں زیرِ بحث ہے نہ ان الفاظ سے اس کے متضاد کوئی مفہوم نکلتا ہے۔ سورج کا نکلنا اور غروب ہونا اہلِ زمین کا آنکھ سے روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ مشاہدہ زمین کی محوری گردش کا مرہون ہے۔ قرآنِ مجید کے اولین مخاطب ان باتوں سے ناواقف تھے۔ لہٰذا ان کی سطح کے مطابق ان سے بات کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی آپ کے لیے دل چسپی کا باعث ہو گی کہ یہی سائنس دان اپنی روز مرہ کی گفتگو میں سورج کے طلوع و غروب اور مشرق و مغرب کے الفاظ اپنے روایتی معنی ہی میں بولتے ہیں۔

(طالب محسن)

طالب محسن

"مختصر تاریخ خلافتِ اسلامیہ"

مصنف: عبد القدوس ہاشمی

صفحات: ۲۸۰

ملنے کا پتا: دار التذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰۔ فون ۷۲۳۱۱۱۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زیرِ نظر کتاب کے نام ہی سے واضح ہے کہ اس کا موضوع تاریخ ہے۔ تیرہ سو اکتیس قمری برسوں پر محیط تاریخ جس کا آغاز خلافتِ راشدہ سے ہوا اور جس کا انجام ترکی میں خلافتِ عثمانیہ کے زوال پر ہوا۔ اہلِ مکہ کے مذہبی تشدد کا شکار چند نفوس مدینہ پہنچے۔ ایک ریاست قائم ہوئی، جس کا رقبہ چند میل تک محدود تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ ریاست پھیلتی چلی گئی اور براعظم ایشیا کی تمام اہم سلطنتیں اس کا حصہ بن گئیں۔ بلکہ براعظم یورپ کے بھی کئی علاقے اس کے زیرِ نگیں آ گئے۔ یہ کتاب اسی ریاست کے آغاز و انجام اور مد و جزر کی کہانی سناتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف کا مقصد محض تاریخ نگاری نہیں بلکہ اس کے پیشِ نظر اپنے قاری کو عظیم خلافتِ اسلامیہ سے متعارف کرانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تیرہ سو سال کی کہانی کو دو اڑھائی سو صفحات میں سمو دیا ہے۔ اس اعتبار سے مصنف اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اس طویل زمانے کے اہم واقعات اور تاریخی دھارے کے بڑے بڑے موڑ سامنے آ جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں عام قاری بڑی بڑی تصنیفات پڑھنے کا وقت نہیں پاتا۔ یہ کتاب اس قاری کے لیے بہت مفید ہے۔

تاریخ کی کسی بھی کتاب کا مطالعہ کریں، عام طور پر ہر مصنف ایک نقطۂ نظر کے مطابق واقعات کو سامنے لاتا

اور اپنے قاری کی ایک رائے بنانا چاہتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کی ایک کتاب ہے۔ مصنف اسلامی خلافت کے احیا کی شدید تمنا رکھتا ہے اور اپنے قاری کو خلافت اسلامیہ کی عظمت کی بھرپور جھلک دکھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ مصنف اسلامی تاریخ کے ہر اس حکمران کا دفاع کرتا ہے، جس کے بارے میں غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، یا جس کی خاص مقصد کے تحت کردار کشی کی گئی ہے۔ تصنیف کے اس مقصد کو بیان کرتے ہوئے پیش لفظ میں لکھا گیا ہے:

''میں نے مشہور محقق، مصنف اور مؤتمر العالم اسلامی، مرکزی دفتر کے ڈائریکٹر مونا سید عبدالقدوس ہاشمی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ایک مختصر سی کتاب خلافت اسمیہ کے تعارف اور تاریخ پر لکھی جائے جو اگرچہ ایک فہرست ہی کی حیثیت رکھتی ہو مگر اس میں خلفاے اسلام کے نام و نشان آ جائیں۔

شائد اس سے بعض وہ غلط فہمیاں بھی رفع ہو جائیں جو خاص خاص غرض سے تاریخ لکھنے والوں نے پھیلا دی ہیں۔'' (ص: ۱۲)

مصنف نے مختلف ادوار کو بیان کرنے میں سب سے زیادہ صفحات خلافتِ راشدہ کے لیے مختص کیے ہیں۔ ظاہر ہے خلافتِ اسلامیہ میں خلافت راشدہ کی خاص اہمیت ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ایک شان دار سلطنت کا آغاز ہوا بلکہ یہ دور آنے والے تمام ادوار کے لیے آئیڈیل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

مصنف کا اسلوبِ بیان سادہ ہے اور ایک عام پڑھے لکھے قاری کے لیے یہ ایک موزوں کتاب ہے۔ مصنف نے بہت سی کتب کا مطالعہ کر کے ایک مفید ملخص تیار کیا ہے۔ تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں تمام خلافتوں کی ایک فہرست بھی دے دی ہے۔ جس سے ہر حکمران کا دور اور زمانہ ایک نظر میں سامنے آ جاتا ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں ہر دور کی مناسبت سے اگر نقشے بھی شامل کر دیے جاتے تو یہ کتاب زیادہ لائقِ استفادہ ہو جاتی۔

اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کے بارے میں مصنف نے منفرد آرا ظاہر کی ہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے موقع پر حضرت علی اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم کے بیعت نہ کرنے کا واقعہ عام بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن مصنف اس کی بھرپور تردید کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''بعض جعلی روایتوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر چھ ماہ تک بیعت نہیں کی، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بے جا اور غلط الزام ہے۔ انھوں نے اسی دن حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی، جس دن دوسرے صحابہ نے بیعت کی تھی۔ اور حضرت علی

رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے زمانے ہی سے حضرت ابو بکر الصدیق کی امامت میں نمازیں ادا کرتے تھے، وہ بیعت سے انکار کیوں کرتے۔ بعض فسانہ گویوں نے یہ افسانہ بھی تراشا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ الخزرجی انصاری نے کبھی بیعت ہی نہیں کی اور چھ ماہ کے بعد وفات پاگئے۔ یہ محض افسانہ ہے، حضرت سعد نے وہیں سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت کر لی تھی۔ لیکن چونکہ وہ بیمار تھے۔ اور اسی بیماری میں وفات پاگئے، اسی لیے ان کا ذکر عہدِ صدیقی میں نہیں ملتا۔ وہ بیماری ہی میں مدینہ کے ایک قریبی گاؤں میں بغرض صحت چلے گئے تھے، جہاں چند دنوں میں ان کا انتقال ہو گیا۔" (ص ۵۱)

البتہ خلافت راشدہ میں خود خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہوتا تھا اس کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر روایتی ہے۔

مصنف نے بعض مقامات پر خلفا کی شخصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کردار نگاری بھی کی ہے۔ مثلاً حضرت عمر کی ہجرت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں صحابہ کو ہجرت کر کے مدینہ جانے کی اجازت فرمائی تو مکہ مکرمہ سے صحابہ چھپ چھپا کر مدینہ منورہ جانے لگے۔ کفار روکتے اور ستاتے تھے اس لیے لوگ چھپ کر مکہ مکرمہ سے نکل جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر کی ہجرت سے چند یوم قبل حضرت عمر نے بھی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی۔ لیکن فاروقی جلالت سے یہ بعید تھا کہ وہ چھپ کر مکہ سے نکلتے۔ انھوں نے اس شان سے ہجرت فرمائی کہ ہتھیار بدن پر سجا کر کعبہ کے پاس آئے۔ کعبہ کا طواف کیا۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد قریش کے عمائد کو جو وہاں موجود تھے، فرمایا: "میں یہاں سے ہجرت کر کے حسب حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم یثرب (مدینہ منورہ) جا رہا ہوں۔ جو چاہتا ہو کہ اس کی ماں روئے، اس کی بیوی بیوہ ہو جائے اور بچے یتیم ہو جائیں وہ مجھ کو آکر روکے۔"

سارے کفار دم بخود بیٹھے رہے، نہ کوئی اٹھا اور نہ کوئی کچھ بولا۔" (ص ۷۶)

خلافت راشدہ کے ضمن میں مصنف نے ان کے طرزِ حکومت اور نظام حکومت کو بطور خاص موضوع بنایا ہے۔

خلافت راشدہ کے دور کی تعیین میں بھی مصنف کا نقطۂ نظر عام مورخین سے مختلف ہے۔ لکھتے ہیں:

"... چھ بزرگ یعنی ابو بکر صدیق اکبر، حضرت عمرِ فاروق، حضرت عثمان ذی النورین، حضرت علی المرتضی، حضرت حسن بن علی اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ کبار تھے۔ انھیں خلفاے راشدین کہا جاتا ہے اور ان کی خلافت کو خلافت راشدہ کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ۱۱

ہجری سے ۶۰ ہجری یعنی حضرت صدیق اکبر کی خلافت سے شروع ہو کر حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی وفات تک شمار ہوتا ہے۔

بنی عباس کے عہد میں بعض سیاسی وجوہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروان ثانی تک کے خلفا کو خلفاے بنو امیہ کہا گیا اور ان کے عہد کو خلافت بنی امیہ کا نام دیا گیا۔ یہی اموی خلافت کا دور کہلاتا ہے۔ اس طرح خلافت راشدہ کے عہد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ تک محدود کر دیا گیا۔ بنو عباس کے عہد میں جو کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے اکثر میں عہدِ خلافت کی تقسیم اسی طرح ہوئی اور یہی اب تک رائج ہے۔''

(ص ۲۴-۲۵)

خلافت راشدہ کے باب میں بعض معلومات بڑی حیرت انگیز ہیں۔ مثلاً مصنف یہ بتاتے ہیں کہ موجودہ نہرِ سویز کا تصور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی سامنے آیا اور اس کی کھدائی کا کام بھی کیا گیا۔ (ص ۸۵) اسی طرح انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایران وغیرہ میں عربی رسم الخط خلافت راشدہ ہی کے زمانے میں رائج ہونا شروع ہو گیا تھا۔ (ص ۹۹)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اموی دور کا ایک اہم واقعہ سانحۂ کربلا ہے۔ مصنف نے اس واقعے کو بیان کرنے میں بھی انفرادی رنگ اپنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''۵۱ ہجری میں حضرت معاویہ نے یزید کو ولی عہد مقرر کیا تھا اور اس کے بموجب ۲۲ رجب ۶۰ ہجری کو ان کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت ہوئی، ساری دنیاے اسلام میں صرف دو اشخاص نے ان کی خلافت کو قبول کرنے سے اختلاف کیا اور آخر دم تک اپنے اختلاف پر قائم رہے۔ ان دو حضرات میں سے ایک حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ تھے، جنھوں نے ۶۱ ہجری میں عراق پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کی اور مقام الطف پر (کربلا) میں بتاریخ یکم محرم (مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰) اپنے ۱۶ ساتھیوں کے ساتھ قتل کر دیے گئے۔ دوسرے شخص حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے ...۔'' (ص ۱۱۵)

یہ انفرادی آرا قاری کی فکرِ رسا کو آواز دیتی ہیں۔ کتاب کا حجم قاری میں پڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ ان خصوصیات کے باعث یہ کتاب عام آدمی کی لائبریری کا ضروری حصہ معلوم ہوتی ہے۔

افسانہ

محمد بلال

اونٹوں کی دنیا

"اللہ دتہ، پانی لاؤ۔"

"جی سر۔" چپڑاسی اللہ دتہ، کلرک کا حکم سن کر اسے پانی لا کر دیتا ہے۔

"اللہ دتہ، یار میرے لیے ذرا سگریٹ تو لے آؤ۔" تھوڑی دیر کے بعد ایک دوسرا کلرک اپنی جیب سے پیسے نکالتے ہوئے کہتا ہے۔ اللہ دتہ سخت گرمی میں بازار سے سگریٹ لا کر دیتا ہے۔

"اللہ دتہ، یہ میری میز صاف کر دو..... چائے گر گئی ہے۔" اللہ دتہ سگریٹ دے کر ہٹا ہی ہے کہ اکاؤنٹنٹ نے کام کہہ دیا۔

"جی سر"۔ اللہ دتہ میز صاف کرتا ہے۔

چند منٹوں کے بعد ایک بیل بجتی ہے۔ اللہ دتہ فوراً ڈپٹی ڈائریکٹر کے کمرے میں جاتا ہے۔ ائرکنڈیشنڈ اور وال ٹو وال کارپیٹڈ کمرے میں بہت آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا یہ افسر اخبار پڑھ رہا ہے۔ اللہ دتہ کو سامنے پا کر اپنا بریف کیس کھولتا ہے۔ اور ٹیلی فون کا بل اللہ دتہ کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے:

"اسے جمع کرا آؤ۔ لمبی لائن دیکھ کر گھبرانا نہیں ہے۔ آج اسے ہر صورت میں جمع کرانا ہے۔ آخری تاریخ ہے اس کی۔"

"جی سر۔"

اللہ دتہ چلچلاتی دھوپ میں اپنی سائیکل کو ہینڈل سے پکڑے گیٹ سے نکلتا ہی ہے کہ ڈائریکٹر جنرل کی گاڑی اس کے قریب آ کر رکتی ہے۔ ڈائریکٹر جنرل گاڑی سے نکلتا ہے۔ اُس کے ساتھ اس کے کچھ دوست بھی ہیں۔ وہ

اللہ دتہ کو انگلی کے اشارے سے قریب بلاتا ہے اور پوچھتا ہے:

''کہاں جا رہے ہو؟''

اللہ دتہ مسکینی سے وضاحت کرتا ہے: بل جمع کروانے۔ ڈائریکٹر جنرل قدرے گردن اکڑا کر بولتا ہے:

''یہ میرے دوست آئے ہیں۔ پہلے ان کے لیے کیک اور سموسے لے آؤ..... ابھی جاؤ اور پانچ منٹ میں واپس آؤ۔''

''جی سر۔''

O

اللہ دتہ کیک اور سموسے لانے کے لیے سڑک پر جا رہا ہے اس نے ابھی بل بھی جمع کرانا ہے۔ آج بل جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ وہ بہت تیز سائیکل چلا رہا ہے۔ دور اسے چوک پر ٹریفک کی سبز بتی جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ''وقت بچانے کے لیے مجھے سرخ بتی جلنے سے پہلے چوک کراس کر لینا چاہیے۔'' یہ سوچ کر اللہ دتہ سائیکل کے ہینڈل پر قدرے جھک کر تیز سائیکل چلاتا ہے۔ ابھی وہ چوک کے قریب زیبرا کراسنگ کے پاس پہنچتا ہی ہے کہ سرخ بتی روشن ہو جاتی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے سائیکل روکتا ہے۔ لیکن زیبرا کراسنگ کے اوپر۔ اسی اثنا میں ایک بہت قیمتی کار اس کے بالکل ساتھ چیخ مار کر رکتی ہے۔ قریب کھڑا ٹریفک کا سارجنٹ ان کے پاس آتا ہے اور کار والے کو کہتا ہے:

''پلیز، اپنی گاڑی زیبرا کراسنگ سے پیچھے کر لیں۔'' گاڑی والے کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے ہیں۔ وہ بادلِ نخواستہ گاڑی پیچھے کرتا ہے۔ سارجنٹ مسکرا کر اسے ''تھینک یو'' کہتا ہے۔ پھر وہ اللہ دتہ کو دیکھتا ہے۔ غصے سے گھورتے ہوئے اس کے قریب آتا ہے۔ اپنی چھڑی اس کی سائیکل کے اگلے ٹائر پر مارتے ہوئے کہتا ہے:

''پیچھے مر''۔

اللہ دتہ فوراً اپنی سائیکل پیچھے کرتا ہے۔ وہ سارجنٹ کے رویے پر صبر بھی کرتا ہے اور شکر بھی کہ اس نے اس کے ٹائر کی ہوا نہیں نکالی۔

O

رات کا وقت ہے۔ اللہ دتہ اپنے گھر کے چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ سب گھر والے گہری

نیند سو رہے ہیں لیکن اللہ دتہ جاگ رہا ہے۔ نیند اس سے کوسوں دور ہے۔ آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا ہے۔اس کی چاندنی نے اس کے سرخ اینٹوں والے صحن پر سفیدی پھیر دی ہے۔ لیکن اللہ دتہ اس چاند اور اس کی چاندنی اور اس کی سفیدی سے لطف اندوز نہیں ہو رہا۔ وہ اس وقت اپنے خارج سے بے نیاز، اپنے داخل میں ڈوبا ہوا ہے۔ جہاں اماوس کی رات چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اسے اس تاریکی میں اپنی تار تار ردائے ناموس صاف دکھائی دے رہی ہے۔اس کے دل کی نازک رگوں سے خون رِس رہا ہے۔وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا ہے:

''میں لوگوں کی اتنی خدمت کرتا ہوں۔ ان کی کرسی پر ان کی خواہشیں اور ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہوں۔ وہ صاف ستھرے ماحول میں بیٹھے ہوتے ہیں اور میں ان کے لیے باہر سڑکوں کی دھول سے آلودہ ہو رہا ہوتا ہوں۔ وہ گرمیوں میں پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوتے ہیں اور میں ان کے لیے باہر دہکتے سورج کے نیچے جل رہا ہوتا ہوں۔ وہ سردیوں میں بند کمرے میں ہیٹر کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اور میں ان کے لیے باہر ہڈیوں میں اترنے والی یخ ہواؤں میں ٹھٹھر رہا ہوتا ہوں۔ دفتر کے سب کلرک اور افسر عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ لیکن کوئی بھی مجھے ''آپ'' کہہ کر نہیں پکارتا۔ کوئی بھی میرے نام کے ساتھ ''صاحب'' کا لفظ نہیں لگاتا۔ لوگ مجھے قابلِ احترام کیوں نہیں سمجھتے۔ لوگ میرا انسانی درجہ کیوں نہیں مانتے۔ میرے اندر بھی عزتِ نفس ہے، لوگ اس کا وجود تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ دنیا میں انسانوں میں فرق خدا نے امتحان کے لیے رکھا ہے، لوگ اس فرق کو برتری اور کمتری کا معیار کیوں بنائے ہوئے ہیں۔''

اللہ دتہ بڑے کرب کے ساتھ ان سوالوں پر غور کرتا ہے۔ اس کے ذہن کے ایک گوشے سے اس کا جواب آتا ہے:

''اس دنیا میں عزت، طاقت ور کی ہوتی ہے۔ یہ طاقت، دولت کی بھی ہوتی ہے، علم کی بھی اور اختیارات کی بھی۔ تم ایک دفتر میں چپڑاسی ہو۔ نہ تمھارے پاس دولت ہے، نہ علم اور نہ اختیارات۔

خیالوں اور خوابوں کی دنیا سے نکلو اللہ دتہ۔ حقیقت کی دنیا میں ایک حقیقت پسند آدمی کی طرح رہو۔ تم ایک چھوٹے آدمی ہو۔ ایک حقیر آدمی ہو۔ اور حقیر آدمی کی اس دنیا میں عزت نہیں ہوتی۔''

اللہ دتہ یہ جواب سن کر ایک سرد آہ بھرتا ہے اور اپنی آنکھوں سے ڈھلکنے والے پانی کو انگلیوں کی پوروں سے خشک کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے داخل سے نکلتا ہے اور اپنے خارج کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چودھویں کا چاند چمک رہا ہے لیکن اسے وہ سیاہ دکھائی دے رہا ہے۔

O

ایک دن اللہ دتہ کو معلوم ہوتا ہے کہ دفتر میں ڈائریکٹر جنرل کا تبادلہ ہو گیا ہے۔اب وہاں اس عہدے پر عبید اللہ نور آنے والا ہے۔ عبید اللہ نور..... نئے ڈائریکٹر جنرل کا نام سنتے ہی اللہ دتہ کا چہرہ خوشی سے پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے۔اس کی خوشی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اب اس کی تنخواہ بڑھ جائے گی۔اس کی خوشی کی وجہ یہ ہے کہ اب اس کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوگی۔اب اس کی عزتِ نفس کو مکھی مچھر کی طرح کچلا نہیں جائے گا۔

نیا ڈائریکٹر جنرل باصلاحیت نوجوان ہے۔وہ بڑا دین دار ہے۔وہ بہت اچھی تقریریں کرتا ہے۔اللہ دتہ باذوق آدمی ہے۔اس کے پاس دنیوی ڈگریاں نہیں ہیں لیکن وہ دین کا اچھا فہم رکھتا ہے۔اس نے بھی عبید اللہ نور کی ایک تقریر سنی ہوئی ہے۔اس وقت اللہ دتہ کی یادداشت کے پردے پر ایک منظر بار بار ابھر رہا ہے۔وہ دیکھ رہا ہے:

”ایک بہت بڑے ہال میں مذہبی سیمینار ہو رہا ہے۔وہاں عبید اللہ نور تقریر کر رہا ہے:

ہم سب آدم کی اولاد ہیں۔ایک ہی شخص کی نسل ہیں۔ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں..... برہمن اور شودر کی تقسیم بے معنی ہے..... چودھری اور کمی کمین کا فرقہ بے ہودہ ہے..... سب انسان برابر ہیں..... سب انسان یکساں طور پر قابلِ احترام ہیں۔

ہمارے ہادیِ اکبر نے کالے پر گورے کی فضیلت کا انکار کر کے انسانی فضیلت کے دنیوی معیارات کو اپنے پیروں تلے روند دیا۔ہاں، اس نے ایک معیار تسلیم کیا اور وہ ہے تقویٰ۔

یاد رکھیے، کسی شخص کو اپنے سے حقیر سمجھنا، تکبر ہے۔اور متکبر کے بارے میں سن لیں کہ وہ ایک نامراد آدمی ہے۔جس شخص کے اندر رائی کے برابر بھی تکبر ہوا، اس کا جنت میں جانا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرنا محال ہے۔“

”اللہ دتہ..... اللہ دتہ..... کہاں پہنچے ہوئے ہو..... یہ فائل اندر صاحب کو دے کر آؤ۔“

اکاؤنٹنٹ کا حکم اللہ دتہ کو ایک خوش گوار یاد سے نکالتا ہے۔

O

رات کا وقت ہے۔اللہ دتہ اپنے صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔خوشی کی وجہ سے نیند اس سے کوسوں دور ہے۔وہ اماوس کی رات ہے۔اللہ دتہ کے خارج میں بہت تاریکی ہے لیکن اس کے داخل میں بہت روشنی ہے۔وہاں تو چودھویں کی رات ہے۔وہ چمکتی ہوئی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھ رہا ہے:

”نئے ڈائریکٹر جنرل عبید اللہ نور نے دفتر کے تمام ملازمین کو اپنے دفتر میں بلایا ہوا ہے۔ وہ خبردار کرنے کے انداز میں بڑی جذباتی گفتگو کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے: میں اس دفتر میں دین کے منافی کوئی بات برداشت نہیں کروں گا۔ آج کے بعد کوئی ورکر دوسرے ورکر کو غیر مہذب اسلوب میں نہیں پکارے گا۔ اللہ دتہ صاحب کا دفتری منصب جو بھی ہو وہ عمر میں ہم سب سے بڑے ہیں۔ سب انھیں اللہ دتہ صاحب اور آپ کہہ کر پکاریں۔“

خوش گوار خواب دیکھتے دیکھتے اللہ دتہ نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اس رات وہ خواب میں اپنے آپ کو ایک اکڑے ہوئے طرے والی پگڑی پہنے ہوئے بہت خوش دیکھتا ہے۔

O

یہ دوسرے دن کی صبح ہے۔ اللہ دتہ دفتر میں موجود سب سے گھٹیا کرسی یعنی اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ عبید اللہ نور اندر داخل ہوتا ہے۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ سب سے مسکرا کر ہاتھ ملاتا ہے۔ ہر شخص اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا نام بھی بتاتا ہے۔ اللہ دتہ عبید اللہ نور سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے بڑی امید اور عقیدت سے چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اسی اثنا میں ڈپٹی ڈائریکٹر تنویر اختر اپنے کمرے سے نکلتا ہے اور عبید اللہ نور کو بڑے تپاک سے ملتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سب کو ملنے کے بعد عبید اللہ نور اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بیل بجاتا ہے۔ اللہ دتہ فوراً اس کے کمرے میں جاتا ہے۔ عبید اللہ نور اسے کہتا ہے:

”اللہ دتہ ..... تنویر اختر صاحب کو بلاؤ۔ اور دیکھو تنویر صاحب کے آتے ہی دو کپ چائے لے آنا ..... ٹھیک ہے ..... جاؤ اب۔“

عبید اللہ نور کا طرزِ تخاطب اللہ دتہ پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ یہ ملازمت چھوڑ دے۔ لیکن فوراً اسے اپنے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے۔ وہ اپنی یہ خواہش مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنا لعاب نگلتا ہے۔ سر جھکاتا ہے۔ اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا حکم کی تعمیل کرنے کے لیے کمرے سے چلا جاتا ہے۔

خیال و خامہ

جاوید

صبح بہاراں

[بچوں کے لیے]

صبحِ بہاراں، صبحِ بہاراں   اِس میں کچھ کچھ موسمِ باراں
بستی بستی، گاؤں گاؤں   پھیل رہی ہے ابر کی چھاؤں
دُور پپیہا بول رہا ہے   کانوں میں رس گھول رہا ہے
آؤ بچو، سیر کو جائیں   من کے کھیت میں پھول کھلائیں
چڑیا گانا گاتی دیکھیں   بلبل راگ سناتی دیکھیں
باغ میں کلیاں کھلتی دیکھیں   جھوم جھوم کر ہلتی دیکھیں
اودی اودی، نیلی نیلی   سرخ، گلابی، پیلی پیلی
اپنے رنگ بدلتی دیکھیں   تصویروں میں ڈھلتی دیکھیں
پتی پتی پر گل کاری   جیسے بنّو کی عماری
اِس کے ہاتھ میں ایک کٹورا   صبح کی صورت گورا گورا
وہ یاقوت کا ایک پیالہ   اِس پر گنگا جمنی ہالہ
رنگ برنگ کے صافے باندھے   شاخ شاخ پر نافے باندھے
اٹھتے، جھکتے، پھر شرماتے   اپنے رنگوں میں چھپ جاتے
دیکھ رہے ہو گوناگوں ہیں   قدرت کا یہ ایک فسوں ہیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آؤ، اِن میں بیٹھ کے گائیں ‏ ‏ اِن سے سن کر اِنھیں سنائیں
اُس خالق کے گیت سہانے ‏ ‏ ہم کو جس کی ایک ادا نے
بخشی ہے یہ دنیا ساری ‏ ‏ آبی، خاکی، نوری، ناری
یہ سب سائنس دان سیانے ‏ ‏ خوب ہیں اِن کے عذر بہانے

دیکھ رہے ہیں اُس کی شانیں
پھر بھی اُس کو نہ پہچانیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com